الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

رجسٹرڈ نمبر ۲۹۰۲

دائرہ حمیدیہ کی اعانت

دائرہ حمیدیہ کی خدمت و اعانت، کتاب اللہ کی خدمت و اعانت ہے، اس کی تین صورتیں ہیں۔

۱۔ جو حضرات سو روپے یکمشت دائرہ کو عنایت فرمائیں گے وہ دائرہ کے معاون دائمی تصور ہوں گے ان کو دائرہ کا رسالہ "الاصلاح" اور تمام مطبوعات برابر ہدیۃً دی جائیں گی۔

۲۔ جو حضرات پچاس روپیہ یکمشت عنایت فرمائیں گے۔ ان کو رسالہ الاصلاح اور دائرہ کی دوسری مطبوعات برابر نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

۳۔ جو حضرات دس روپئے سالانہ عنایت فرمائیں گے ان کی خدمت میں الاصلاح ہدیۃً جاری کیا جائے گا اور سال بھر کی مطبوعات بلا قیمت بھیجی جائیں گی۔

ہدایات و قواعد

۱۔ الاصلاح ہر انگریزی مہینہ کی پندرہ تک شایع ہوگا۔

۲۔ اگر مہینہ کے آخر تک پرچہ نہ پہنچے، فوراً دفتر کو لکھ کر منگوا لیجئے ورنہ بقیمت بھیجا جائے گا۔

۳۔ مضامین وغیرہ اڈیٹر کے نام بھیجئے اور دفتر سے متعلق امور کے لئے تمام خط و کتابت منیجر سے کیجئے۔

۴۔ دفتر سے خط و کتابت کرنے میں خریداروں کو نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہئے۔

۵۔ چندہ سالانہ چار روپئے۔ بیرون ہند کے لئے چھ روپئے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

عبد الاحد اصلاحی منیجر دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ

محمد عبد الاحد طابع و ناشر نے اصلاحی پریس مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ میں چھاپ کر شایع کیا

دائرہ حمیدیہ کی اردو مطبوعات

تفسیر سورۂ اخلاص

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورۂ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں۔ ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت وطباعت بہترین۔ کاغذ نہایت عمدہ۔ قیمت :۔ ۵ر

تفسیر سورۂ کوثر

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الکوثر کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں کوثر کی تحقیق، خانہ کعبہ کی روحانی حقیقت اور نماز اور قربانی کے اسرار وحقائق پر مصنف نے جو کچھ لکھا ہے اسکی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے کتابت وطباعت جاذب نظر کاغذ عمدہ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۲۲ صفحے قیمت :۔ ۸ر

تفسیر سورۂ لہب

استاذ امام علامہ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ اللہب کا اردو ترجمہ ہے۔ اسمیں عام خیال کی مدلل تردید کی گئی ہے کہ یہ سورہ بددعا ہے۔ ابولہب اور اس کی بیوی کے وجوہ ذکر نہایت اثر انگیز ہیں۔ اس تفسیر کی اصلی عظمت کا اندازہ صرف مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے کتابت وطباعت بہتر کاغذ نہایت عمدہ۔ حجم ۴۰ صفحے قیمت ۶ر

منیجر

جلد ۳ | ماہ جمادی الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۸ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

شذرات	امین احسن اصلاحی	۳۸۹-۳۹۲
معارف قرآن		
تفسیر سورہ قیامہ	استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ	۳۹۳-۳۹۸
ذبیح کون ہے؟	" " "	۳۹۹-۴۰۸
مذاکرہ		
بلاغ الحق	جناب مولوی حافظ سید محمد طہ اشرف صاحب ندوی	۴۰۹-۴۱۵
مقالات		
سیرت شبلی	جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے علیگ	۴۱۶-۴۲۰
اشتراکیت پر ایک سرسری نظر	جناب ناصر اصلاحی	۴۲۱-۴۲۸
حکمت مغرب		
مارکس اور ہیگل کے خیالات	جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے	۴۲۸-۴۳۴
تلخیصات		
یورپ اور امریکہ کے عجیب وغریب مذہب	جناب عبد اللطیف صاحب اعظمی	۴۳۳-۴۳۸

شذرات

چند مغالطے

آج تنظیم تنظیم کے ہنگامہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اخبارات میں، رسائل میں، منبروں پر، اسٹیجوں پر، ہر جگہ ایک ہی پکار ہے کہ مسلمان منظم ہو جائیں۔ یہ پکار مبارک ہے، کسی قوم کی طاقت کا راز تنظیم ہی میں مضمر ہے بلکہ قوم، قوم ہی وہی ہے جو منظم ہو۔ جو منظم نہ ہو وہ بھیڑ ہے، انبوہ ہے، چوپایوں کا گلہ ہے، بکریوں کا ریوڑ ہے، مگر قوم نہیں ہے۔ لیکن یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ تنظیم مقصد نہیں ہے، ذریعہ ہے۔ اس لئے تنظیم تنہا کافی نہیں ہے، یہ بھی دیکھئے کہ تنظیم کس مقصد کیلئے ہے؟ اس کی بنیاد کن اصولوں اور کن مبادی پر ہے؟ بازار کے چبوترے پر ایک اشتہاری دوا فروش اپنی عجیب عجیب صداؤں سے اپنے ارد گرد ہزاروں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتا ہے۔ مگر یہ بھیڑ ایک طرف سے جمع ہوتی ہے اور دوسری طرف سے چھٹتی بھی رہتی ہے اور سورج کے غروب ہوتے ہوتے ہم دیکھتے ہیں کہ دوا فروش اپنی پھیلی ہوئی شیشیاں جمع کر رہا ہے اور ایک متنفس بھی موجود نہیں ہے جو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ پس اس طرح کے ہجوم کو تنظیم نہیں کہنا چاہئے۔ تنظیم مقاصد اور اصول کیلئے ہوتی ہے، پھر وہ پروپیگنڈے کے ذریعہ نہیں ہوتی، تبلیغ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے۔ نیز وہ آندھی اور طوفان کی طرح نہیں اٹھتی، قطرہ قطرہ کرکے دریا اور دانہ دانہ کرکے خرمن بنتی ہے۔ اس میں نگاہ کمیت پر نہیں ہوتی، صرف کیفیت پر ہوتی ہے۔ تنظیم عاقل و بالغ انسانوں کا وہ اجتماع ہے جس کے ہر فرد کو عقائد و اصول کی وحدت نے باہم جکڑ دیا ہو، جن میں سے ہر ایک نے ان اصولوں کو دل سے مان لیا ہو اور زبان سے ان کا اقرار کر لیا ہو، اور پھر اسی قدر نہیں بلکہ سب سے آخری مگر سب سے اہم شرط یہ بھی ہے کہ ان اصولوں کی قولاً و عملاً شہادت بھی دیں، ان کیلئے اپنی زندگی کا تمام عیش تاراج کر دیں، یہاں تک کہ اگر ضرورت پیش آ جائے تو خود زندگی کو ان اصولوں کی خاطر قربان کر دیں، اور یہی وہ حقیقی اور غیر مشتبہ شہادت ہے جس سے کسی تنظیم کی اصلی روح کا اندازہ ہوتا ہے۔

اپنی موجودہ تنظیم کو جس پر آپ کو اتنا ناز ہے، ذرا تھوڑی دیر کیلئے خود بینی کے غرور اور جذبات کے ہیجان سے الگ ہو کر دیکھئے، اس نگاہ سے نہیں جو اپنے عیب کو ہنر اور دوسروں کے ہنر کو بھی عیب بنا دیتی ہے، مومن کی نگاہ سے ـــــ جو ہمیشہ خلق کے

دکھتی ہے، اور عجب و خود پسندی کے سحر سے کبھی مسحور نہیں ہوتی۔ دیکھئے کہ آپ کی تنظیم کی بنیاد کیا ہے؟ آپ نے اس کی نیو کس چیز پر قائم کی ہے؟ توحید پر؟ قیامت پر؟ سرور کونین کی رسالت پر؟ وحدت اعمال پر؟ اتحاد عقائد پر؟ قرآن پر؟ حدیث پر؟ اچھا ان چیزوں میں سے کسی چیز پر نہ سہی، ان سے کسی ادنیٰ اور گھٹیا درجہ کی چیز پر سہی، ملک کی آزادی پر؟ زمینداروں کی خدمت پر؟ کاشتکاروں کی بہبود پر؟ آخر کوئی چھوٹا بڑا مقصد آپ کے سامنے ہے جس کیلئے یہ تنظیم کا غل ہے یا محض تماشہ ہی تماشہ ہے؟ اور وہ مقصد اگر آپ نے کچھ چھپا رکھا ہو (اللہ علیم بخفیات القلوب) لیکن جو چیزیں کہ آنکھوں کے سامنے اور دن کی روشنی میں ہیں ان کو دیکھ کر تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساری تنظیم صرف اکثریت کے خطروں اور اندیشوں پر مبنی ہے؟ یہ اندیشے واقعی ہیں یا غیر واقعی؟ ہم تھوڑی دیر کیلئے تسلیم کر لیتے ہیں کہ واقعی ہیں، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی ہم ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ تنظیم کوئی نئی چیز نہیں ہے، انگریزوں کے ہاتھوں بالکل نئی طرزوں اور نئے ہنگاموں کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد ہی سے شروع ہو گئی تھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد سے آج تک ہندوستان میں کوئی انگریز حکمراں ایسا نہیں آیا جس نے اکثریت کی چیرہ دستیوں سے بچاؤ کیلئے مسلمانوں کی تنظیم اپنی حکومت کی سب سے پہلی قرار داد نہ سمجھی ہو، اور یہ تنظیم اس تھوڑے سے وقفہ کے سوا، جو تحریک خلافت نے پیدا کر دیا تھا، پورے استحکام کے ساتھ برابر باقی رہی ہے، اور ہم سے زیادہ ہمارے مہربان حکام نے اس کی حفاظت و تربیت کی ذمہ داریاں محسوس کی ہیں، اور جب تک موجودہ سیاسی ضروریات باقی ہیں، اور حالات کوئی نئی کروٹ نہیں بدلتے، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم الشان انسانی و سیاسی فرض سے، جو بحیثیت ہمارے فرمانروا ہونے کے، ان پر عائد ہوتا ہے بے پروا ہو جائیں گے۔ پس جو چیز پہلے ہی سے موجود، اور پورے استحکام و قوت کے ساتھ موجود ہے اس پر مزید جوڑنے گانٹھنے کے اسراف کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اکثریت آپ کے اس حصن حصین میں سرنگ لگانے کی فکر میں ہے تو نصیب اعدا آپ کیوں اس درجہ مضطرب اور سراسیمہ ہیں، جبکہ ہماری معزز حکومت ایک لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپیہ سرحد پر روزانہ خرچ کر کے محض دشمنی خطروں کا سد باب کرتی رہتی ہے کیا وہ اتنی بیہوش اور بے خرد ہو گئی ہے کہ وہ اپنے حلقہ بگوش رعایا کی ہڈی کو یونہی اعداء کے حملوں کا ہدف بننے کیلئے چھوڑ دے گی؟ اگر وہ ایسا کرے گی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اب اسے خود اپنے وجود کی کوئی پرواہ نہیں رہ گئی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے اور بالفرض وہ اپنے وجود سے بے پرواہ بھی ہو چکی ہو تاہم مسیح کے اس پیغام سے تو وہ کبھی بے پرواہ نہیں ہو سکتی جو کمزوروں کی حمایت کیلئے سب سے مقدس پیغام ہے اور جس کی حامل اب روئے زمین پر تنہا حکومت برطانیہ رہ گئی ہے۔

اگر آپ سچ مچ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو کسی اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں صرف اللہ سے ڈرایئے اور یہ کام پروپگنڈے سے انجام نہیں پاسکتا، اس کیلئے تبلیغ کی ضرورت ہے۔ تبلیغ اور پروپگنڈے میں بہت فرق ہے۔ پروپگنڈا شیطان کی ایجاد ہے اور تبلیغ انبیاء و صالحین کا ہتھیار ہے۔ شیطانی پروپگنڈے کی تصویر قرآن نے یوں کھینچی ہے:-

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ إِلَّا غُرُورًا

گھبرا دے تو ان میں سے جن کو گھبرا سکے اپنے شور و ہنگامہ سے اور چڑھا لا ان پر اپنے سوار اور پیادے اور شریک بن جا ان کے مال اور اولاد میں اور انکو (طرح طرح) کے وعدوں میں پھنسا اور شیطان

اور انبیاء کا طریقہ یہ ہے۔

ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

اور پکار اپنے رب کے رستہ کی طرف حکمت اور موعظت کے ذریعہ بلاؤ اور ان سے عمدہ طریقہ پر مجادلہ کرو۔

پروپگنڈے سے صرف ایک بھیڑ جمع ہوتی ہے، جو جمع ہونے سے پہلے چھٹ جانے کیلئے آمادہ رہتی ہے۔ پروپگنڈے کی تمام کامیابیاں اجتماعی عقل کی کمزوری پر منحصر ہیں۔ عوام جذبات کے سیلاب میں بہتے ہیں، عقل کی روشنی میں نہیں چلتے۔ پس "جو چیز جذبات کو ابھار دے، آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرا کردے" پروپگنڈے کے ترکش کا سب سے زیادہ قیمتی تیر ہے۔ یورپ میں اس چیز نے ایک فن کی حیثیت اختیار کرلی ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ آج مغرب کا سب سے زیادہ کامیاب اور ترقی یافتہ فن یہی ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ مغربی دنیا کے اس سب سے زیادہ محبوب فن سے زیادہ اسلام کے نزدیک کوئی شے مبغوض نہیں۔ آپ اسلام کے نام سے جو کام بھی کرنا چاہیں، خواہ اپنی تنظیم ہو یا دوسروں کی اصلاح، اس کیلئے سچائی، حکمت، عقل اور سلامت روی کی ایک معلوم شاہراہ ہے جس کے تمام حدود و اطراف متعین ہیں، اس سے ایک انچ بھی اگر آپ ہٹے تو وہ اسلام کی راہ نہیں ہوتی، وہ دنیا اور دنیا طلبوں کی راہ ہوگئی، اور اس کی منزل اسلام کی منزل سے بالکل الگ۔

جب آپ مسلمانوں کی تنظیم کا نام لیتے ہیں تو ان کو انہی طریقوں پر منظم کیجئے جو اسلام نے بتائے ہیں اور نگاہ صرف کیفیت پر رکھئے، موجودہ زمانہ کے عام اصول کے مطابق "سروں کو مت گنئے" یہ دیکھئے کہ آپ کے پیش کردہ اصولوں کے کتنے مدعی ہیں،

کتنے ماننے والے ہوئے اور کتنے ان کے لئے گردنیں دے سکتے ہیں۔ اور صحیح اصول کے مطابق صرف ان کو شمار میں رکھئے جو گردنیں دے سکتے ہوں۔ بس وہی کوشش کا حاصل ہیں۔ وہ اگرچہ غریب و مفلس ہوں، اگرچہ تعداد میں تھوڑے ہوں لیکن اگر آپ انکی خدمت و تربیت میں لگے رہے اور کثرت تعداد و اصحاب مال و زر کی فکر میں نہ پڑے تو آپ کی وہی چھوٹی سی جماعت منظم ہوکر تمام دنیا کیلئے نمک بن جائیگی، باقی چیخنے والے کوؤں کے غول تو ہر درخت پر جمع ہوتے ہیں، نہ ان کو جماعت کہئے نہ ان کے ازدحام کو تنظیم۔ قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھئے اور اس کے مطالب پر غور فرمایئے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا

(کہف)

اور اپنے تئیں ثابت قدم رکھو ان تھوڑے سے لوگوں کے ساتھ جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں، اسکی رضا چاہتے ہیں اور نہ دوڑیں تمہاری نگاہیں ان سے بڑھکر دنیاوی زندگی کی زینت کی تلاش میں (یعنی اس فکر کی طلب مزدہ نہیں ہو کہ اغنیا جماعت میں شامل ہو جائیں کہ انکا تمول تقویت جماعت

آپ کی یہ تنظیم جس کے لئے بھیڑ کا لفظ زیادہ موزوں ہے، جو تبلیغ کی جانفشانیوں کے بجائے پروپگنڈے کے سحر سے جمع کی گئی ہے، جس کو اصول کے اعتماد و یقین کی جگہ چند موہوم خطرات نے اکٹھا کردیا ہے، جس کے عزم و اخلاق کی ایک مرتبہ بھی آزمائش نہیں کی، جس کے داعی اور مدعو، طالب اور مطلوب دونوں ضعیف، جو جمع ہونے سے زیادہ تیزی کے ساتھ منتشر بھی ہوجاسکتی ہے۔ اور جس کا ضرر اسلام اور مسلمانوں کیلئے اس کے نفع سے زیادہ قریب، حیرت ہے کہ اگر کوئی اس غوغائے عام میں شریک نہیں تو آپ اس کو غدار ملت، خائن قوم، فی الدرک الاسفل من النار کا مستحق اور من شذ شذ فی النار کا مستوجب قرار دیتے ہیں حالانکہ اس کے جماعت ہونے کی آپکے پاس بڑی سے بڑی دلیل صرف یہ ہے کہ اس کی تعداد زیادہ ہے لیکن اگر تعداد کی زیادتی اتنی اہم شئے ہے تو قرآن کی اس آیت کا کیا مطلب ہے؟

قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ فَاتَّقُوا اللَّهَ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ

کہہ دو خبیث اور طیب دونوں برابر نہیں ہو سکتے اگرچہ خبیث کی کثرت تمہارے دل کو بھا رہی ہو، پس اللہ سے ڈرو اے اہل عقل!

یہ مائدہ کی آیت ہے جو سورۃ العہد والمیثاق ہے اور معلوم ہے کہ منجملہ ان محرکات کے جو سچائی کے راستے سے قدم ہٹا دیتے ہیں، ایک بہت بڑا محرک شیطانی وسوسہ بھی ہے کہ فلاں بات کے ماننے والے یا فلاں شخص کے پوجنے والے بہت ہیں۔ پس کیوں نہ ہم بھی اسی بت کے آگے سر جھکا دیں جس کے سامنے سب نے سر جھکا دیا ہے۔ قرآن نے یہاں اسی وسوسہ کا سر کچلا ہے کہ سچائی اور حقیقت کا معیار کثرت و قلت تعداد نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک بہت بڑی بھیڑ ہو اور وہ خاک کے کسی تودے یا چاندی کے کسی ڈھیر کو پوج رہی ہو اور تم اگرچہ تنہا ہو لیکن ایمان اور سچائی کا کوہ نور تمہارے ہی پاس ہو۔ پس حق کا فیصلہ کرنے والی میزان قلت و کثرت تعداد نہیں ہے، عقل ہے۔ پس اے اہل حق، اس حقیقت پر نگاہ رکھو۔ یہاں اولوالالباب کے خطاب کی بلاغت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔

سقراط نے کیسی عمدہ بات کہی تھی کہ مجھے تمام دنیا کی پروا نہیں ہے صرف میں ایک انسان کی پروا کرتا ہوں جو عقلمند ہے۔ مگر اس حماقت پرستی کے زمانہ میں جبکہ بازار میں گہر اور پتھر دونوں برابر برابر بکتے ہوں، ان باتوں کے سمجھنے والے دماغ کو کوئی کہاں سے ڈھونڈھ لے!

یہی سورہ مائدہ جس کا اوپر ذکر ہوا، بیشمار ایسے مثال و حکم سے مملو ہے جن میں یہ نکتہ سمجھایا گیا ہے کہ اگر پوری قوم کی قوم کسی فتنہ میں پڑ کر دیوانی اور مخبوط ہو جائے اور اللہ اور اس کی کتاب کے رشتہ کو چھوڑ بیٹھے اور اپنی ایمانی طاقت و قوت کو انسانوں کے ہیبت و رعب کے آگے سرنگوں ہو جانے دے تو اس وقت قوم کے اہل حق اور ارباب بصیرت و استقامت کا شیوہ کیا ہونا چاہئے۔ صرف اس ایک سورت سے اللہ کی توفیق سے انسانی زندگی کی اس پر آزمائش گھڑی کیلئے ہدایت و رہنمائی کے تمام ابواب جمع کر دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ فرمایا:-

يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۔ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۔ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنْ

يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۔ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۔ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔ (مائدہ)

اے میری قوم، داخل ہو جاؤ اس مقدس سرزمین میں جو اللہ نے تمہارے لئے لکھ دی ہے اور اپنی پیٹھ پیچھے نہ پلٹو کہ تم نامرادوں میں ہو جاؤ۔ بولے اے موسیٰ اس میں طاقتور لوگ ہیں اور ہم اس میں داخل نہ ہوں گے تاآنکہ وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ پس اگر وہ وہاں سے نکل گئے تو ہم اس میں داخل ہوں گے۔ دو آدمیوں نے جو ان لوگوں میں سے تھے جو اللہ سے ڈرتے تھے، جن دونوں پر اللہ نے انعام کیا تھا، کہا (بے دھڑک) داخل ہو جاؤ، پس جب تم داخل ہو جاؤ گے تو تمہیں غالب رہو گے، اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم سچے مومن ہو۔

ان آیتوں کو خوب غور سے پڑھو۔ حضرت موسیٰ اپنی قوم سے فرماتے ہیں کہ فلسطین میں داخل ہو جاؤ لیکن ساری قوم پر جبن و بزدلی کی موت طاری ہے۔ وہ جواب دیتی ہے کہ عمالقہ طاقتور ہیں، تعداد میں زیادہ ہیں، ان کے پاس مال و زر ہے۔ ہم داخل ہوئے اور وہ ہم کو نگل گئے۔ پس اس وقت تک ہم اس سرزمین کی طرف قدم بھی نہ بڑھائیں گے جب تک یہ موجود ہیں، ہاں یہ نکل جائیں گے تو ہم داخل ہو سکتے ہیں۔ دیکھو پوری قوم کا دل خوف سے بیٹھ چکا ہے صرف ایک چھوٹی سی جماعت زندہ ہے۔ ان میں سے صرف خدا کے دو بندوں میں ایمان اور زندگی کی پوری حرارت موجود ہے۔ چونکہ وہ خدا سے ڈرتے ہیں (یخافون) اسلئے انسانوں کے ڈر سے، چاہے انکی تعداد کتنی ہی ہو، ان کے دل آشنا نہیں ہیں۔ قوم کی عام گمراہی کے باوجود ان کو راہ حق معلوم ہے (انعم اللہ علیہما۔ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآن میں منعم علیہم اس جماعت کو کہا گیا ہے جو صراط مستقیم پر ہو، اس کی شرح طولانی ہے) قوم کی اس بزدلی اور گمراہی پر ان کا ایمان جوش میں آتا ہے، وہ پکارتے ہیں کہ اے لوگو! بزدل مت بنو، آگے بڑھکر داخل ہو جاؤ۔ تعداد کی کثرت اور سر و سامان کی قوت سے مت ڈرو، خدا پر بھروسہ کرو، اس کا بھروسہ ہی اصل قوت ہے۔

قرآن مجید کا اعجاز دیکھو وہ کس طرح ہماری زندگی کے تمام گوشوں کے لئے اپنے اندر ہدایت رکھتا ہے اور کس طرح اس نے بنی اسرائیل کی زندگی کی یہ سرگذشت ہمارے لئے محفوظ کر دی جو ہزاروں برس کے بعد بھی ہمارے حالات پر اس طرح منطبق ہو رہی ہے گویا آج ہی کی حکایت ہے۔ ع جامہ بود کہ بر قامت او دوختہ بود۔

آؤ آج کے حالات کا تجزیہ کرو!

(۱) تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتحمندی تمہارے ہی لئے ہے۔

(۲) لیکن اکثریت کے خوف اور اس کے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے، اس لئے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک ذلت پر لوٹ رہے ہو۔

(۳) صرف تھوڑے ہیں جو زندہ ہیں اس لئے کہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ پس انسانوں کا خوف کبھی ان کو نہیں ڈراتا۔

(۴) اور ان میں سے شاید وہی ہیں جو غیرت و حمیت ایمانی کا اصلی جوش رکھتے ہیں اور ان پر اللہ کا انعام ہے اس لئے ایک پوری بھیڑ کے غوغا نے بھی ان کی راہ گم نہیں کی ہے۔

(۵) وہ تعداد کی کثرت اور سروسامان کی فراوانی سے زیادہ اللہ پر بھروسہ رکھتے ہیں اس لئے کہ وہ سچے مومن ہیں۔ اور پورا یقین رکھتے ہیں کہ اگر ہم نے عزم و ہمت کے ساتھ قدم بڑھائے تو آخر کی فتحمندی ہمارے ہی لئے ہے۔

اب ایمان داری کے ساتھ فیصلہ کرو کہ یہاں قرآن کس کے ساتھ ہے؟ بہت بڑی بھیڑ کے ساتھ جو خوف و ہراس کے بستر پر دم توڑ رہی ہے، یا عزم و ہمت کے ان دو داعیوں کے ساتھ جو وقت کے غوغائے عام میں اپنی راہ دیکھ رہے ہیں اور بے دھڑک اسی کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہیں؟ مگر تم تو ان کو من شذ شذ فی النار اور فی الدرک الاسفل من النار کی وعید سناتے ہو کہ وہ تمہاری جماعت سے الگ ہو گئے۔ ان ھذا لشیٔ عجاب ۔

معارف قرآن

تفسیر سورۂ قیامہ

(۳)

تالیف استاذ و امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ

۹۔ جس طرح شہادت میں قیامت اور نفس لوامہ دونوں کو ساتھ ساتھ پیش کیا اسی طرح آگے چل کر قیامت اور نفس لوامہ کے صفات بھی ایک ہی ذیل میں بیان کیے۔ نفس لوامہ کی صفت بصیرت بیان فرمائی ہے۔ اور بصیرت کو ناقابل انکار رہونا اس امر سے ثابت کیا ہے کہ انسان اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے کتنے ہی عذرات اور حیلے تراشے لیکن وہ کسی طرح بھی اسکو مطمئن نہیں کر سکتا۔ دل کے پردوں میں کوئی چھپی ہوئی زبان برابر اس کو ٹوکتی اور سرزنش کرتی رہتی ہے۔ اور اندر سے ملامت کی ایک ٹیس برابر اٹھتی رہتی ہے۔ تا آنکہ انسان کی شرارت اور بدنفسی اس حد تک بڑھ جائے کہ اس کے اعمال کی سیاہی اس کے قلب کا احاطہ کرکے اس کو بالکل اندھا بہرا کر دے اور اس میں نیک و بد کے امتیاز کے لئے کوئی روشنی باقی نہ رہ جائے۔ یہ نفس انسانی کی شقاوت کی آخری حد ہے جس کے بعد اصلاح کی تمام امیدوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اور انسان پر وہ حالت طاری ہو جاتی ہے جس کو قرآن مجید نے خَتَمَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِہِمْ یعنی دلوں پر مہر کر دینے کے الفاظ سے تعبیر فرمایا۔ اور اندھوں اور بہروں کی یہی وہ بدبخت جماعت ہے جس سے اعراض کرنے اور درگذر کرنے کا آنحضرت صلعم کو قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا ہے۔

فَاَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ذٰلِکَ
پس جنھوں نے ہمارے ذکر سے منہ موڑا اور صرف دنیا کی زندگی پر قانع ہو گئے ان سے اعراض کرو

مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ — ان کے علم کی رسائی یہیں تک ہے۔

چنانچہ اس سورہ میں بھی جب اس جماعت کا ذکر ہوا تو ان سے اعراض کا حکم دیا گیا جیسا کہ ہم آگے لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ کی تفسیر کرتے ہوئے کھولیں گے۔

۱۰۔ قیامت اور نفس لوامہ کا ذکر ایک ساتھ آنے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان دونوں میں کوئی گہرا معنوی ربط ہے، چنانچہ غور و تدبر سے بعض نہایت لطیف حقائق روشنی میں آتے ہیں۔

قیامت لوامہ نفس کلی ہے۔ اس حقیقت کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے کسی قدر تفصیل کی ضرورت ہے۔

یہ عالم جو دیکھنے میں ہم کو نہایت پریشان اور منتشر نظر آتا ہے حقیقت کے اعتبار سے نہایت ہم آہنگ اور مربوط ہے۔ اس کے تمام اجزاء و عناصر میں ایک نظم تالیف ہے جو ان سب کو ایک رشتہ میں جوڑ کر اس کو ایک حسین وحدت کے قالب میں ڈھالتی ہے اور جس طرح ایک انسان کا جسم اپنے اعضاء و جوارح کے اختلاف کے باوجود ایک باطنی شیرازہ میں بندھی ہوئی وحدت ہے ٹھیک یہی حال اس مجموعی کائنات کا ہے۔ پس یہ عالم اپنی وحدت اور اپنی ہم آہنگی کے اعتبار سے گویا ایک شخص ہے اور جس طرح ہر انسان کے اندر اس کے افعال پر ملامت کرنے کے لئے ایک نفس لوامہ ہے، اسی طرح اس عالم کے احوال و معاملات پر ملامت کرنے کے لئے بھی ایک نفس لوامہ ہے اور یہی نفس لوامہ ہے جس میں اس عالم کی صلاح و فلاح کی تمام روح پوشیدہ ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ تمام نظام کائنات ظلم و عدوان اور شرارت و معصیت کے ہاتھوں برباد ہو کے رہ جائے۔ یہ جو تم دیکھتے ہو کہ یہ دنیا بگڑ بگڑ کے بنتی اور اجڑ اجڑ کے سنورتی ہے تو یہ سب اسی مشاطۂ جمال روح نفس لوامہ کی کارفرمائی ہے۔ اس دنیا کا شیرازہ بارہا بکھرا اور مجتمع ہو گیا۔ یہ اپنے مرکز سے بارہا ہٹی اور پھر صحیح راہ پر لگ گئی۔ کتنی بار ہم نے دیکھا کہ اس کے تمام اجرام باہم ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔ مگر ایک مخفی ہاتھ بادلوں میں چھپا ہوا گویا اس بات کا منتظر ہی بیٹھا ہوا تھا کہ یہ زلف الجھے اور وہ نمودار ہو کر اس کو سلجھا دے چنانچہ یہ کل جب جب بگڑی اس نے ہر بار نمودار ہو کر اس کے کل پرزوں کو بٹھایا اور بگڑنے سے بچا لیا۔ یہ طویل بحث ہے

اس پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ لیکن اہل نظر سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کائنات کے اندر اصلاح و درستگی کی ایک مخفی روح کارفرما ہے۔ اندھیری راتوں کے بعد دن کی تابانی، جاڑے کی خزاں سامانیوں کے بعد ربیع کی بہار آفرینی، قحط کی خشکی و یبوست کے بعد ابر و باد کی تردستیوں کے جلوے ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، ان سب میں اسی مشاطۂ مستور کے عجائب اور کرشمے ہم دیکھتے ہیں۔

یہ تغیرات اس مادی دنیا کے ہیں، ٹھیک ٹھیک یہی تغیرات اس دنیا کے اخلاقی عالم میں بھی طاری ہوتے ہیں۔ اس میں بھی ہماری مادی دنیا کی ربیع و خریف کی طرح بہار و خزاں کی نیرنگیاں نمودار ہوتی ہیں۔ البتہ دونوں کی شکلوں میں کسی قدر فرق ہوتا ہے اور نام بھی کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ تمہاری مادی دنیا میں بہار آتی ہے تو تم کہتے ہو خشکی و ویرانی کے بعد سرسبزی و شادابی کا موسم آگیا لیکن یہی چیز جب اخلاقی عالم میں نمودار ہوتی ہے تو کہتے ہیں بدی کے بعد نیکی کا دور سعادت آگیا، ظلم و جور کی ظلمت کے بعد اخلاق اور انسانیت کی زندگی نے کروٹ لی۔

یہ چند اجمالی اشارات ہیں ان کی تفصیل سورہ اعلیٰ کی تفسیر میں ملے گی۔

الغرض قیامت کی اصل حقیقت یہ ہے کہ وہ اس کائنات کے نفس کلی کے لئے بمنزلہ لوامہ ہے۔ چنانچہ دیکھو کہ قیامت اور وہ نفس لوامہ جو ہم میں سے ہر شخص کے اندر موجود ہے اور جو گویا ہمارے عالم باطن کے اندر قیامت کی ایک مثال یعنی قیامت صغریٰ ہے اپنی خصوصیات و صفات میں دونوں بالکل یکساں ہیں۔ قیامت نفس کلی کیلئے لوامہ ہے یعنی جو کچھ اس نے کیا ہے وہ سب اس کے سامنے ایک روز رکھ دیگی۔

يُنَبَّؤُا الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ — انسان اس دن جان لیگا جو کچھ اس نے آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا۔

اور بعینہ یہی حال ہمارے اندر کے نفس لوامہ کا ہے کہ وہ ہمارے سامنے ہمارے اعمال کی اصل حقیقت رکھ دیتا ہے۔

بَلِ الْإِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ بلکہ انسان اپنے نفس پر خود بصیرت ہے۔

اس سمٹے ہوئے نقطہ کو ذرا اور پھیلا کر غور کرو تو یہ بات بھی تم پر روشن ہو جائے گی کہ ہر پیغمبر اپنی قوم کیلئے بمنزلہ نفس لوامہ کے ہوتا ہے اور خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی بعثت چونکہ تمام کائنات کے لئے ہوئی اسلئے آپ تمام بنی آدم کے لئے نفس لوامہ ہیں اور اس اعتبار سے گویا آپ قیامت اور دیونت عالم کی مثال ہیں۔ اس نکتہ کو ہم نے اپنی کتاب ملکوت اللہ میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور کسی قدر تفسیر سورہ صف میں بھی اس پر روشنی ڈالی ہے۔

۱۱۔ فاذا برق البصر سے لیکر ولو القی معاذیرہ تک کی تفسیر ایک حد تک بیان ہو چکی اور تیسری فصل میں ہم نے کلام کے اصلی پہلو کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اب ہم ان آیات کے مضمون کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے قیامت کی اس ہیئت کی تصویر کھینچی ہے جو اس کے ظہور کے دن لوگوں کے سامنے آئے گی اور جو نگاہوں کو خیرہ، اور جس کی ہولناکی اور وحشت تمام سرگشتگان غفلت کو جھنجھوڑ کر جگا دے گی۔ باقی رہے یہ سوالات کہ چاند کس طرح گہنائے گا؟ یا سورج یا چاند کس طرح یکجا ہو جائیں گے تو اس کی نسبت ہم کتاب متشابہات میں لکھ چکے ہیں کہ قیامت کے احوال و معاملات دنیا کے عام احوال و معاملات کی طرح نہیں ہیں کہ ہم اپنی دنیا کے قوانین و ضوابط پر ان کو ٹھیک ٹھیک تول لیں۔ ان کے ذکر کا اصلی مقصد عبرت و تنبیہ ہے۔ اور اس مقصد کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ان کی اصلی نوعیت و کیفیت کی تلاش میں سرگرداں ہوں، بلکہ بعض اعتبارات سے ان کی اصلی کیفیت کے اخفا میں عبرت و تنبیہ زیادہ ہے۔ اس بارہ میں اہل ایمان و یقین کو اور بھی رہے منکرین اور اہل شک، تو ان کو جواب دینے کی مناسب راہ یہ ہوگی کہ ان احوال و واقعات کی مناسبت اور قربت قدرت کے ان عام احوال و معاملات سے ظاہر کر دی جائے جن سے وہ واقف ہیں لیکن یہ صرف ایک طرح کی مناسبت اور قربت کا اظہار ہوگا، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قیامت کے احوال ٹھیک ٹھیک یونہی یا اسی طرح ہوں گے۔ مقصود صرف یہ دکھانا ہوگا کہ تمہارے جانے بوجھے واقعات فطرت کی روشنی میں احوال قیامت کو مستبعد نہیں کہا جا سکتا۔

مثلاً ایک منکر کے سامنے اس آیت کے متعلق ہم یوں تقریر کر سکتے ہیں کہ تم تسلیم کرتے ہو کہ اجرام کی حرارت اگر ان کا احوال ان چیزوں ہو تو ٹھنڈا ہو تو بتدریج گھٹ جاتی ہے اسی طرح تم یہ بھی مانتے ہو کہ اجرام وجود بسبب شدید حرارت اور ہوائیت کے بعد سیلان اور پھر برودت اور جمود کی حالت کو پہنچتے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ بات بھی پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ بہت سے اجرام سورج کی طرف جذب ہو کر اسمیں جا پڑے۔ پس اگر یہ تمام باتیں تمہارے نزدیک ثابت اور صحیح ہیں تو پھر تم کو اس کے باور کرنے میں کیوں شک ہو کہ ایک دن چاند اور ہمارا یہ کرۂ زمین بھی سورج کی طرف کھنچ جائے گا۔ اور چونکہ سورج کی حرارت اس وقت کم ہو جائے گی، اس لئے باوجود سورج سے قربت کے انسان زندہ رہ سکیگا لیکن آفتاب کی روشنی سے اس کی نگاہیں خیرہ ہوں گی۔ اسی طرح چاند پہلے تو گہنا جائے گا کیونکہ کرۂ زمین کے سورج کے قریب پہنچ جانے کی وجہ سے چاند کی روشنی جاتی رہے گی۔ چنانچہ حضرت قتادہ اور حضرت حسن سے مروی ہے کہ "خسف قمر" کے معنی یہ ہیں کہ اس کی روشنی جاتی رہے گی اور پھر آخر میں اس میں جا پڑیگا جیسا کہ خسف کا اصلی مفہوم ہے جو قرآن کی متعدد آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً قارون کے قصہ میں ہے کہ فخسفنا بہ وبدارہ الارض پس ہم نے اس کو اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا اور اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس وقت چاند اپنے مدار سے ہٹ جائے گا۔

یہ سب باتیں قیامت کے قریب پیش آئیں گی باقی رہا آج تو آج تو یہ نظام مضبوطی، باقاعدگی اور خوبصورتی کا بہتر سے بہتر نظام ہے۔ تمام اجرام اپنے اپنے دائرہ کے اندر گردش کر رہے ہیں اور قدرت نے جو مقاصد و مصالح ان سے وابستہ کر دیئے ہیں ان کو بہتر سے بہتر طریقہ پر پورا کر رہے ہیں۔

وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ	اور ان کے لئے نشانی ہے رات اس سے ہم کھینچ لیتے
فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ	ہیں دن کو پس وہ دفعۃً تاریکی میں ہو جاتے ہیں
لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ	اور سورج اپنے ایک مدار پر گردش کرتا ہے یہ ایک عزیز
الْعَلِيْمِ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ	علیم کا کارخانہ ہے اور چاند کے لئے ہم نے منزلیں ٹھہرا دی
حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ	ہیں یہانتک کہ وہ ہو جاتا ہے کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح۔

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ	نہ سورج کو حق ہے کہ وہ چاند کو جا لے اور نہ شب
الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ	دن پر سبقت کرتی ہے اور سب الگ الگ فلک
وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۔ یٰسٓ	میں تیرتے ہیں۔

یعنی ان کے چھپ جانے، سورج کے ایک ٹھہرائے ہوئے مستقر پر گردش کرنے اور چاند کے گھٹنے بڑھنے میں اس کی نہایت واضح دلیل موجود ہے کہ ایک دن یہ نظام ختم ہو جائے گا۔

پھر دیکھو سورج اور چاند دور ہو کر دونوں قریب ہوتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں ہوتا کہ سورج چاند کو پکڑلے اور نہ زمین کے لئے یہ ممکن ہوتا کہ وہ سورج سے بھاگ جائے کہ سورج کی روشنی زمین کی شب کو نہ پاسکے بلکہ یہ تمام اجرام خیر کسی نظمی اور خلل کے اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں۔ اور اس امر پر روشن دلیل ہیں کہ جو غیر مرئی ہاتھ تمام کارخانہ خلق پر اس طرح حاکم و متصرف ہے وہ ضرور اس پر بھی قادر ہے کہ جب چاہے اس کو درہم برہم کر دے اور یقیناً وہی ذات ...... سب کا مرکز و مرجع ہے۔

پس وہ وقت آئے گا کہ چاند سورج میں جا پڑے گا اور لوگ دیکھیں گے کہ سورج قریب آ رہا ہے اور وہ وقت قریب ہے کہ زمین بھی اس میں جھونک دی جائے۔ اور گھبرا کر بھاگنا چاہیں گے لیکن بھاگنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے تو اس وقت پکاریں گے اين المفر!! یہاں ان مختصر اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ آگے انشاء اللہ ان آیات پر مزید روشنی ڈالیں گے۔ (باقی)

تفسیر سورہ کافرون

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی تفسیر سورہ کافرون کا اردو ترجمہ ہے اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ، تقطیع ۲۰×۲۶/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴/ مینیجر

ذبیح کون ہے؟

قسط ثانی

قرآن مجید سے استدلال

قرآن مجید کے قصص اور دلائل میں تدبر کے لئے بعض اصول

(۷)

۱۸۔ قرآن مجید کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس نے غایت درجہ ایجاز کا اسلوب اختیار کیا ہے۔ اور عبارت ہر قسم کے حشو و زوائد سے بالکل پاک ہے۔ پس جو شخص اس کے قصص اور دلائل پر غور کرنا چاہے، اس کو پہلے معلوم کر لینا چاہئے کہ ان چیزوں کے بیان میں اس کی عام روش کیا ہوتی ہے۔ یہاں ہم اسی چیز کی طرف بعض اشارات کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن مجید میں قصص عبرت اور تعلیم حکمت کے مقصد سے بیان ہوتے ہیں اور بعض اوقات انہی کے ضمن میں ان غلطیوں کی اصلاح بھی کر دی جاتی ہے جو لوگوں نے ان میں کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کیلئے پورے استقصا اور تفصیل کی حاجت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید پر تدبر کرنے والے سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ وہ اس امر کا اہتمام نہیں کرتا کہ ایک واقعہ کو ایک ہی جگہ پوری وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان کر دے بلکہ اس کا عام طریقہ یہ ہے کہ ایک واقعہ کا کچھ حصہ ایک جگہ بیان کرتا ہے اور اسی کا کچھ حصہ دوسری جگہ ذکر کرتا ہے۔ اور بعض اوقات ان دونوں سے الگ ایک تیسری راہ اختیار کرتا ہے۔ یعنی پورے قصہ یا اس کے کسی ایک حصہ کی طرف محض ایک سرسری اشارہ کر کے گذر جاتا ہے اور حقیقت کے اعتبار سے یہ اسلوب بھی اسی عام اسلوب بیان کی

ایک شاخ ہے جس کا اوپر بیان ہوا کیونکہ اس کی تہ میں بھی بلاغت بیان کا وہی اسلوب مخفی ہے کہ بات صرف اتنی کہی جائے جتنی کے لئے موقع کلام مقتضی ہو۔ ہمارے علماء اس رمز سے واقف تھے چنانچہ اسی وجہ سے انکا ایک اصول یہ ہوا کہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصہ کی تفسیر کرتا ہے۔ پس جو چیز تمہیں ایک جگہ مجمل ملے گی وہی چیز دوسری جگہ پوری تفصیل کے ساتھ سامنے آجائے گی۔ قرآن مجید کی تفسیر میں یہ اصول اہم اصول ہے جو ہر غور کرنے والے کے پیش نظر رہنا چاہئے۔

دلائل و حجج کے بیان میں بھی ایجاز اور بلاغت بیان کا یہی انداز ہوتا ہے۔ اکثر تو یہ ہوتا ہے کہ قرآن انکو صرف بطریق اشارہ ذکر کرکے گذر جاتا ہے اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ دلیل کے اہم مقدمات کو بیان کر دیتا ہے اور جو بہو ظاہر ہوتے ہیں ان کو چھوڑ جاتا ہے۔ عقلیات کے باب میں عام انداز یہی ہے۔ نقلیات میں صرف مشہور و مسلم پہلو کی طرف انگلی اٹھا دیتا ہے۔ اور چونکہ اس باب میں مقصود اصلی عبرت و یاد دہانی اور بخشش و عذاب کے عام قوانین الٰہیہ کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے اس لئے تخویف و تہدید کا مضمون اکثر ان کے ساتھ لگا ہوا ہوتا ہے۔

قصص و دلائل پر غور کرتے ہوئے ان دو بنیادی اصولوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے، ورنہ صحیح نتیجہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب اس معاملہ پر غور کرو۔ قرآن مجید نے ذبیح کا واقعہ پوری وضاحت کے ساتھ صرف ایک جگہ بیان کیا ہے۔ باقی مختلف مقامات میں صرف اشارات پر اکتفا کیا ہے اور بعض خاص حکیمانہ وجوہ کی بنا پر جنکا ذکر تفصیل فصل ۳۰ میں ہوا ہے ذبیح کا نام تصریح کے ساتھ کہیں بھی نہیں لیا۔

لیکن یہ قطعی ہے کہ ذبیح یا تو حضرت اسمٰعیلؑ تھے یا حضرت اسحٰقؑ۔ کوئی تیسرا اس شرف کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے صرف انہی دو بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر قرآن مجید میں ایسے روشن دلائل موجود نہ ہوتے جو پوری تصریح کے ساتھ ذبیح کی شخصیت کو متعین کر رہے ہیں تو یقیناً ہم اس باب میں سکوت کا مسلک اختیار کرتے اور ایک ایسی بات کو کرید نا پسند نہ کرتے جس کی تصریح سے قرآن نے سکوت اختیار کیا۔ بلکہ جیسا کہ ہمارے بعض علماء نے کہا کہ "اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ ان میں ذبیح

کون ہے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ دونوں ہی صالح، نیکوکار اور فرمانبردار تھے"۔ ہم بھی یہی قول دہرا کر بحث کو ختم کر دیتے۔ ہم مسلمانوں کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ پیغمبروں میں سے کسی پیغمبر کے لئے عصبیت کا داعیہ اپنے اندر پیدا کریں۔ اس قسم کی بیجا عصبیت اور تفریق بین الرسل دوسروں کی خصوصیت ہے۔

لیکن، جیسا کہ تم آگے چلکر دیکھو گے، معاملہ کی نوعیت یہ نہیں ہے، بلکہ اس کے بالکل برعکس قرآن مجید میں نہایت واضح اور قطعی دلائل ایسے موجود ہیں جو ذبیح کی شخصیت کو بغیر کسی شائبہ شک و تذبذب کے متعین کر دیتے ہیں اور قرآن مجید ہی کی طرف سے ہم اس بات کے لئے مامور ہیں کہ اس کی آیات میں تدبر کریں اور ان کے اندر جو معانی و حقائق پوشیدہ ہیں ان کو کھولیں کہ صحیح تاویل بے نقاب ہو۔ چنانچہ ہمارے علماء نے تعیین ذبیح کے معاملہ پر آیات قرآن کی روشنی میں غور کیا اور ان کے نتائج تحقیق کتابوں میں موجود ہیں۔ ہم پہلے قرآن مجید کے نصوص و اشارات کو پیش کرنا چاہتے ہیں۔ روایات اور علماء کے اقوال سے تیسرے باب میں تعرض کریں گے

وَاقِعَۂ ذبیح قرآن مجید کی روشنی میں

۱۹- قرآن مجید نے سورۃ الصّٰفّٰت میں واقعہ ذبیح کو ایک ہی سلسلہ میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي	بولے بناؤ اس کے لئے ایک گھر اور ڈالو اس کو
الْجَحِيمِ ۝ فَأَرَادُوا بِهِ كَيْدًا فَجَعَلْنَاهُمُ	آگ کے ڈھیر میں، پس انھوں نے اس کے ساتھ ایک داؤ
الْأَسْفَلِينَ ۝ وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ	کرنا چاہا تو ہم نے انہی کو نیچا دکھایا۔ اور اس نے کہا میں
رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ رَبِّ هَبْ لِي	اپنے پروردگار کی طرف جاتا ہوں وہ میری رہبری فرمائے گا
مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ	پروردگار مجھے صالح اولاد بخش تو ہم نے اسکو ایک حلیم

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ	بیٹے کی بشارت دی پس جب وہ اس کے ساتھ دوڑنے پھرنے
اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ اَذْبَحُكَ	کے قابل ہوا اس نے کہا اے بیٹے میں خواب میں دیکھتا
فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۔ قَالَ يٰاَبَتِ	ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں۔ پس تو بتا کہ تیری کیا
افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ	رائے ہے کہا اے ابا جان وہ کیجئے جو آپ کو حکم ملا ہے۔
اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۔ فَلَمَّا اَسْلَمَا	انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔ پس جب دونوں
وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۔ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ	خدا کی اطاعت میں سرافگندہ ہو گئے اور اس کو پیشانی کے
يّٰاِبْرٰهِيْمُ ۔ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا	بل پچھاڑ دیا اور ہم نے اس کو پکارا اے ابراہیم تم نے
اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۔ اِنَّ	خواب کو سچ کر دکھایا، ہم اخلاص و راستی کی راہ چلنے
هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰؤُا الْمُبِيْنُ ۔ وَ	والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔ بے شک یہی کھلی
فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۔ وَتَرَكْنَا	ہوئی آزمائش ہے۔ اور ہم نے اس کو چھڑا لیا ایک
عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۔ سَلٰمٌ عَلٰى	ذبح عظیم کے بدلہ اور باقی رکھا ہم نے اس پر بعد
اِبْرٰهِيْمَ ۔ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ	والوں میں۔ سلامتی ہو ابراہیم پر اسی طرح ہم بدلہ
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۔ وَ	دیتے ہیں اخلاص و راستی کی راہ چلنے والوں کو
بَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ	بے شک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے اسکو
وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰى اِسْحٰقَ وَمِنْ	خوشخبری دی اسحق کی جو نبی ہوگا نیکوکاروں میں
ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ	اور برکت دی ہم نے اس پر اور اسحق پر اور انکی ذریت میں نیکوکار
مُبِيْنٌ ۔ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى	بھی ہیں اور اپنے حق میں صریح ظالم بھی۔
وَهٰرُوْنَ ۔	ہم نے احسان کیا موسیٰ اور ہارون پر

یہاں ہم نے اصل واقعہ سے آگے پیچھے کی آیات بھی نقل کر دی ہیں تاکہ واضح رہے کہ سلسلہ بیان کا

کوئی حرف بھی ہم نے نظر انداز نہیں کیا ہے

ان آیات کے پیش کرنے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ اگرچہ یہاں ذبیح کا نام تصریح کے ساتھ نہیں نہیں آیا ہے لیکن ایسے واضح دلائل و قرائن موجود ہیں کہ بغیر کسی تردد کے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ مراد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔ اصل مدار بحث اس تعیین پر ہے کہ فبشرنٰہ بغلام حلیم (پس ہم نے اس کو ایک حلیم بیٹے کی خوشخبری دی) میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دونوں بیٹوں میں سے کس بیٹے کی طرف اشارہ ہے۔ اگر اس کی تعیین ہو جائے تو بحث کا سارا الجھاؤ ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ امر دلائل کی روشنی میں طے شدہ ہے کہ اس آیت میں جس بیٹے کی طرف اشارہ ہے وہی ذبیح ہے۔ اب ہم ان وجوہ و دلائل کی تفصیل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

پہلی دلیل

ذبیح کا ذکر دعا کے بعد آیا ہے

۲۰۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک صالح بیٹے کے لئے دعا فرمائی تھی رب ھب لی من الصالحین اور یہ دعا اس وقت فرمائی تھی جب ان کے کوئی اولاد نہیں تھی ورنہ ظاہر ہے کہ اولاد ہوتے ہوئے وہ ان لفظوں میں دعا کیسے کر سکتے تھے اور اگر کرتے تو یہ جواب ملتا کہ تمھیں اولاد مل چکی ہے۔ تورات میں اس امر کی تصریح موجود ہے۔ چھٹی اور ساتویں فصل میں ہم اس کی توضیح کر چکے ہیں۔ پس یہاں اسی دعا کو اس کی بشارت قبولیت کے ساتھ ذکر فرمایا اور دعا اور قبولیت میں حرف ف کے واسطہ سے تعلق قائم کیا۔ فبشرنٰہ بغلام حلیم (پس ہم نے اس کو ایک حلیم بیٹے کی خوشخبری دی) جس سے یہ صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ اسی بیٹے کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو قبولیت دعا کے طور پر عطا فرمایا۔ پھر یہیں سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ یہی حلیم و بردبار بیٹا حضرت ابراہیم کی اکلوتی اولاد ہے۔ اور جب کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ ذبیح کا حکم

اکلوتے بیٹے کے لئے ہوا تھا تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہوجاتی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہیں کیونکہ اکلوتے بیٹے وہی ہیں۔

ہمارے نزدیک استدلال کا پہلو یہ نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے صرف ایک ہی بیٹے کے لئے دعا فرمائی تھی جیسا کہ امام رازی رحمہ اللہ نے سمجھا ہے۔ اور جس کا ذکر فصل ۲۰ میں آئے گا۔ بلکہ دعا عام تھی اور معاملہ کو فضل الٰہی کے حوالہ کیا گیا تھا کہ چاہے ایک صالح اولاد عطا ہو یا ایک سے زیادہ۔ بلکہ دعا کے الفاظ میں ایک سے زیادہ کے لئے نہایت لطیف اشارہ بھی چھپا ہوا ہے۔ اور موقع دعا کے لحاظ سے یہی بات مناسب بھی تھی چنانچہ دوسری جگہ دل کی یہ مخفی خواہش الفاظ میں صاف ٹپک پڑی ہے

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ — میرے پروردگار مجھے نماز کا قائم کرنے والا بنا اور

وَمِنْ ذُرِّيَّتِي — اور میری اولاد میں سے

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تعداد کا معاملہ انھوں نے فضل الٰہی کے حوالہ کر دیا تھا۔

پس ہمارے استدلال کی قوت کا انحصار اس امر پر نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک ہی بیٹے کے لئے دعا فرمائی تھی۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ دعا اگرچہ عام ہے۔ اگرچہ وہ ان تمام صالح بیٹوں اور پوتوں پر شامل ہے جو ان کو عطا ہوئے۔ با ایں ہمہ فبشرناہ بغلام حلیم میں جس بیٹے کا ذکر ہے وہ وہی اکلوتا بیٹا ہے جو قبولیت دعا کی بشارت بنکر تمام اولادوں سے پہلے عطا ہوا یعنی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام —— کیونکہ انہی کا ذکر دامن دعا کے ساتھ بندھا ہوا نظر آتا ہے۔ گویا دعا ایک شجرۂ مبارکہ تھی جس کے اولین ثمرہ وہ ہیں۔

پس اس میں ذرا شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دعا کی قبولیت حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت سے ہوئی۔ باقی رہے دوسرے بیٹے اور پوتے تو گو سب اسی شجرۂ مبارکہ کے اثمار و ریاحین ہیں لیکن ان کی حیثیت بفضل مزید اور عطیہ و نافلہ کی ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے جو خود قرآن کے الفاظ میں پوری تصریح کے ساتھ موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے ووہبنا لہ اسحٰق ویعقوب نافلۃ یعنی ہم نے اسکو عطا فرمائے اسحٰق و یعقوب اپنی طرف سے

ایک فضل مزید کے طور پر۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے پہلے بیٹے کا نام اسمٰعیل رکھا۔ یعنی وہ جس کے باب میں اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ پس حضرت اسحٰق و حضرت یعقوب علیہما السلام اگرچہ عموم دعا اور عموم بخشش میں شامل ہیں لیکن فبشرناہ بغلام حلیم میں صرف اسی اکلوتے کا ذکر ہے جو اس وقت عطا ہوا جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اولاد نہیں تھی۔

یہاں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ نافلہ یعنی فضل مزید ہونے میں حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں یکساں ہیں۔ اس اعتبار سے ان میں کسی قسم کا فرق نہیں قائم کیا جاسکتا۔ بعض مفسرین نے نافلہ سے مراد مخصوص طور پر حضرت یعقوبؑ کو لیا ہے لیکن میرے نزدیک حضرت اسحٰقؑ کا نافلہ ہونا زیادہ اقرب بلکہ واضح ہے۔ کہ وہ بغیر کسی دعا اور انتظار کے عطا ہوئے۔ ان مفسرین کی غلط فہمی کی بنیاد یہ ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ثمرہ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو قرار دیتے ہیں اور حضرت یعقوبؑ کو اس سے الگ قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان تمام دلائل کی روشنی میں جو گذر چکے ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ ان مفسرین نے یہ مسموم تخم یہود کے ہاتھوں سے لیا ہے۔ اور پھر مزید لطف یہ ہوا کہ اس غلطی نے ایک دوسری غلطی کیلئے بنیادیں استوار کر دیں یعنی بعضوں نے یہیں سے یہ سمجھا کہ نافلہ پوتے کو کہتے ہیں اور جامد مقلدوں نے ایک قدم آگے بڑھا کر اس کو کتب لغت میں بھی جگہ دیدی۔ حالانکہ اس معنی کے لئے کلام عرب کی کوئی سند بھی موجود نہیں ہے اور ائمہ لغت اس سے علانیہ انکار کر رہے ہیں۔ پس اس طرح کے اقوال سے دھوکے میں نہ پڑنا چاہئے۔

دوسری دلیل

اس دعا کی دوسری نظیر اور نظم کا اشارہ

(۲)۔ جس طرح مذکورہ واقعہ میں ذبیح کا ذکر بالکل دعا کے ساتھ لگا ہوا اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کا ذکر بعد

دیا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ بھی ذکر آیا ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے دعا قبول ہونے پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ وہاں بھی دونوں کے ذکر میں یہی تقدیم و تاخیر ہے۔ وہ فرماتے ہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ وَھَبَ لِیْ عَلَی	اس خدا کا شکر جس نے مجھے عطا فرمائے بڑھاپے
الْکِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِنَّ رَبِّیْ	میں اسمٰعیل اور اسحٰق بے شک میرا پروردگار دعا
لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ	سننے والا ہے۔

یہاں "ان ربی لسمیع الدعاء" میں جس دعا کا حوالہ ہے وہ وہی دعا ہے جو اوپر واقعہ ذبح کی تفصیلات میں گزر چکی ہے۔ یعنی "رب ھب لی من الصالحین"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان دونوں مقامات میں ایک ہی دعا اور اسی کی قبولیت کا ذکر ہے، اور اس سے یہ نتیجہ آپ سے آپ نکلتا ہے کہ فبشرناہ بغلام حلیم میں اسی بیٹے کا ذکر ہے جو پہلے عطا ہوا، اور بشرناہ باسحٰق نبیا من الصالحین میں اس بیٹے کا جو بعد میں عطا ہوا۔ یعنی تقدیم و تاخیر واقعات کی اصلی ترتیب کو واضح کر رہی ہے۔

تیسری دلیل

دونوں نظیروں کی تطبیق ایک دوسرے پہلو سے

۲۳۔ آیت مذکورہ بالا "الحمد للہ الذی وھب لی" الآیۃ، میں صرف یہی نہیں ہے کہ شکر کے موقع پر حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے نام کو مقدم رکھا، بلکہ انھوں نے یہ بات بھی کھول دی کہ ان کا نام اسمٰعیل اسی سے رکھا کہ وہ ان کی دعا کی قبولیت تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ان ربی لسمیع الدعاء بے شک میرا پروردگار دعاؤں کا سننے والا ہے اور اسمٰعیل کے معنی، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں سمیع اللہ (اللہ نے سنا) کے ہیں پس گویا ان کی دعا کی تفصیلی تعبیر یوں ہوں گی "اس پروردگار کا شکر جس نے مجھے عطا فرمایا اسمٰعیل میری دعا کی قبولیت کے طور پر پھر مجھے بخشا اسحٰق فضل مزید کے طور پر"۔ ٹھیک اسی طرح صٰفٰت میں جہاں

واقعہ ذبح بیان فرمایا پہلے بیٹے کا ذکر دعا سے بالکل متصل لا کر بتا دیا کہ یہی بیٹا دعا کی اجابت ہے۔ پس دعا اور اس بیٹے کے بارہ میں جو قبولیت دعا ہے دونوں آیتوں کا بیان ایک ہے۔ کوئی فرق نہیں۔ علاوہ ازیں پہلی آیت سے یہ معلوم ہوا کہ اس سے مراد اسمٰعیلؑ ہیں اور دوسری سے یہ واضح ہو گیا کہ وہی ذبیح ہیں پس اس طرح گویا یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ رب ھب لی من الصالحین۔ فبشرناہ بغلام حلیم میں حضرت اسمٰعیلؑ کے سوا کوئی دوسرا مراد نہیں ہو سکتا۔

چوتھی دلیل

حضرت اسحٰقؑ کی بشارت کے بارہ میں تمام نظائر کا استقصاء

یہاں (سورہ صٰفٰت میں) دو بشارتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ ایک غلام حلیم کی بشارت ہے جو دعا سے بالکل متصل ہے اور دوسری حضرت اسحٰقؑ کی بشارت ہے جو دعا سے بالکل علیحدہ ہے۔ اسی طرح حضرت اسحٰقؑ کی بشارت قرآن مجید میں متعدد مقامات میں وارد ہے۔ لیکن دعا کے ساتھ مذکور ہونا تو الگ رہا کہیں سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان کی ولادت کے لئے کوئی دعا فرمائی ہو یا کم از کم اس کے لئے متوقع ہی رہے ہوں۔ اور بعینہٖ یہی بات تورات سے معلوم ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کی بشارت ایسی حالت میں ملتی ہے کہ نہ وہ ان کی ولادت کے لئے متمنی تھے نہ منتظر۔ چنانچہ جب ان کو بشارت ملتی ہے وہ اس کو سن کر متعجب ہوتے ہیں۔ کتاب پیدائش ۱۷: ۱۷ میں ہے:-

"تب ابراہام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا سو برس کے بڈھے سے کوئی بچہ ہوگا۔ اور کیا سارہ کے جو نوے برس کی ہے اولاد ہوگی۔"

اس تعجب کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایک بیٹا

عطا فرمانے کا وعدہ کیا تھا۔ پس اگر وہ بیٹا حضرت اسحٰق ہی ہوتے تو اس بشارت پر حضرت ابراہیمؑ کو تعجب کیوں ہوتا؟ پس یہ بشارت جو دعا کے ساتھ بطور قبولیت ملائی گئی ہے۔ حضرت اسحٰق کے متعلق ہرگز نہیں ہوسکتی۔ یہ مستقل دلیل ہے اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ایک اور وجہ سے بھی یہ بشارت حضرت اسحٰقؑ کے متعلق نہیں ہوسکتی وہ یہ کہ حضرت اسحٰق کے متعلق جتنی بشارتیں مذکور ہیں ان میں سے ایک بھی کسی دعا سے متصل یا اس پر متفرع نہیں ہے۔ پس اگر اس کو حضرت اسحٰقؑ کے بارہ میں مانا جائے تو یہ اپنے تمام نظائر کے خلاف پڑتی ہے۔ حالانکہ اصول یہ ہے کہ نظیر کو نظیر پر محمول کیا جائے۔ پس ان وجوہ سے ناگزیر ہے کہ اس بشارت کو حضرت اسمٰعیلؑ ہی کے بارہ میں مانا جائے جو اپنے باپ کی دعا کی قبولیت بنکر آئے تھے۔ اور چونکہ اس امر کی تصریح قرآنِ مجید میں مذکور ہے کہ اس بشارت میں جس بیٹے کا ذکر ہے وہی ذبیح ہے۔ اس لئے لازماً یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ذبیح حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ہیں۔

(باقی)

تفسیر سورہ عصر (اردو)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ کی تفسیر سورہ عصر کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ تفسیر خصوصیت کے ساتھ بعض دقیق مباحث قرآنی کی حامل ہے۔ لفظ عصر کی تحقیق، اور زمانہ کی قسم کی تاویل نہایت بصیرت افروز ہے۔ آخر میں ایمان کے مفہوم اور حق و صبر کے باہمی تعلق کی تشریح بھی بڑی اثر انگیز اور ایمان افروز ہے۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۶۶ صفحے۔ کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت جاذب نظر۔ قیمت ۶ر

مینیجر

مُذاکرہ
"بلاغ الحق"
۴

از جناب مولوی حافظ محمد ظہ اشرف صاحب امتھوی

یہ تو آپ کے دلائل پر اجمالی تبصرہ تھا، اب تفصیل کے ساتھ ہر الزام کا جواب دیتا ہوں، فرماتے ہیں "خدا نے فرمایا كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ خدا وارث کے لئے تو وصیت کا حکم صادر فرماتا ہے، اور سے متم بالشان صورت سے فرض کئے ہوئے حکم کو پس پشت ڈالکر اس حکم کے بالکل خلاف اور ظلم یہ ہے کہ رسول کی طرف منسوب کرکے حکم دیا جاتا ہے اور اس کو رسول کی بتائی ہوئی قرآن کی تفسیر کہا جاتا ہے کہ "لا وصية للوارث" وارث کے لئے وصیت ہی جائز نہیں"۔

اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقربا کے لئے وصیت کا حکم بھی دیا۔ اور سب کے لئے حصے بھی مقرر فرما دیئے اور فرمایا "فريضة من الله" اب اگر مورث کی نیت یہ ہے کہ کسی وارث کو اپنی وصیت کے ذریعہ حصہ مقررہ اور "نصيبا مفروضا" سے زیادہ دیدے تو یہ فریضۂ الٰہی کی کھلم کھلا نافرمانی ہوئی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جس کے لئے جو حصے مقرر فرما دئے ہیں، اس میں کسی کو کمی بیشی کا اختیار ہی کیا ہے۔ "مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ" نیز آیت وصیت میں بھی بالمعروف کی قید لگا دی تھی۔ اور آیت میراث میں بھی وصیت کے ذکر کے ساتھ فرمایا گیا "من بعد

وصیۃ یوصی بہا او دین غیر مضار" یعنی وصیت اور دین ورثا کو نقصان پہنچانے کے لئے نہ ہو۔ اوّل صورت میں تو ظاہر ہے کہ دوسرے وارثوں کو نقصان پہنچایا گیا، اور ان کی کھلی ہوئی حق تلفی کی گئی۔ اس لئے "لاوصیۃ للوارث" صرف رسول کی بتائی ہوئی تفسیر نہیں، بلکہ قرآنی تفسیر ہے۔ اور قرآن ہی سے مستنبط، پھر ارشاد ہوتا ہے:-

"اس پر طرفہ تر ظلم یہ کہ ترکہ کی آیتوں کی بھی روایتوں سے اصلاح کر کے وصیت ثلث میں جاری کی ثلث میں وصیت کا جاری ہونا قرآن میں نہیں ہے، اس لئے ترکہ کی آیت بھی اپنی جگہ پر نہ رہی"۔

ترکہ کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہر جگہ "من بعد وصیۃ" فرمایا ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وصیت کل مال میں جاری نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وصیت کے بعد مال کا باقی رہنا ضروری ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی وصیت جاری ہو سکے، اس لئے احادیث سے اس کا اندازہ مقرر کر دیا گیا، کہ وصیت ثلث مال تک جاری ہو سکتی ہے۔ جس طرح "السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیہما" میں قطع ید کی کوئی حد مقرر نہ تھی، کہ ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے، یا کہنی سے یا بغل سے، لیکن حدیث وسنت نے بتا دیا کہ سارق و سارقہ کا ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے، اس میں ترکہ کی آیت کیا جگہ سے بے جگہ ہوئی؟

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

"ترکہ کی تین آیتیں ہیں اور ہر ایک آیت میں خدا نے وصیت کی تاکید فرمائی ہے۔ "من بعد وصیۃ" کے معنی نسخ وصیت کے نہیں ہیں بلکہ بعد کے معنی یہ ہیں کہ وصیت سے مال بچ رہا یا وصیت نہ کر سکا تو اس کی طرف سے خدا نے وصیت کر دی، اسی لئے ترکہ کی آیت میں خدا نے ابتدا ہی میں "یوصیکم اللہ" اور انتہا میں "وصیۃ من اللہ" فرمایا"۔

حکم وصیت کی فرضیت والدین اور اقربا کے لئے منسوخ ہوئی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے خود وصیت کر دی، نہ کہ مطلق وصیت ہی کو منسوخ کہا جاتا ہے۔ اس لئے یہ اعتراض ہی بالکل بے محل ہے۔ وصیت

ان قرابتمندوں کے لئے اب بھی ہو سکتی ہے جن کے لئے خدا نے کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا اور جنھیں موصی اپنے مال سے کچھ دینا چاہے، "من بعد وصیۃ" کے یہی معنی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے والدین اور جن اقربا کے لئے حصے مقرر فرما دیئے ہیں، اس میں تو کمی بیشی ہو ہی نہیں سکتی، مگر جن کے لئے کوئی حصہ مقرر نہیں فرمایا ان کے لئے رخصت اور اجازت ہے کہ تم وصیت کر سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے شروع میں "یوصیکم اللہ" بھی فرمایا اور "فریضۃ من اللہ" بھی۔ اور ترکہ کی تقسیم کے بعد مزید تاکید کے لئے فرمایا کہ "تلک حدود اللہ ومن یطع اللہ ورسولہ یدخلہ جنٰت تجری من تحتہا الانھٰر خٰلدین فیہا وذٰلک الفوز العظیم ومن یعص اللہ ورسولہ ویتعد حدودہ یدخلہ نارا خالدا فیہا ولہ عذاب مہین" تو گویا والدین اور اقربا کے لئے آپ وصیت کو فرض فرما کر حدود الٰہی کو توڑنے کا مشورہ دیتے ہیں، اور اس وعید کا مستوجب بنانا چاہتے ہیں، کیونکہ والدین اور اقربا کے لئے وصیت کرنے میں حدود الٰہی کا توڑنا لازم ہے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے:-

"مطلب یہ ہے کہ اصل شے مفروضۂ خداوندی وصیت ہے، وصیت سے مال بچ رہا یا وصیت نہ کر سکا تو اس کی طرف سے خدا نے وصیت کر دی۔ اور خدا نے بھی وصیت یا ترکہ کی تقسیم والدین اور اقربا کے حق میں کی، وصیت کی آیت میں وصیت کا حکم دیا تھا۔ "للوالدین والاقربین" اپنی وصیت یعنی ترکہ کی آیت میں خدا نے تقسیم کر دیا اور اپنا اصول بتایا کہ "للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر"

اصل شے مفروضۂ خداوندی اگر وصیت ہی ہے تو اس کی صرف دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ موصی اپنی مرضی اور خوشی اور ورثا کی ضرورت کے مطابق جس کو جتنا چاہے دے وہ آزاد اور مختار ہے۔ دوسری اس لئے معلوم کہ خود آپ کی پیش کردہ آیت، جس کے ایک ضروری حصہ کو آپ نے چھوڑ کر نقل فرمایا ہے۔

اس کے منافی ہے کہ "للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون .... مما قل منہ او کثر نصیبا مفروضا" یعنی والدین اور اقربا میں سے ہر ایک کو ان کا مقررہ حصہ ملنا چاہئے، اور آپ نے موصی کو مختار کامل بنا کر چھوڑ دیا ہے کہ جس کو جی چاہے دے یا نہ دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ موصی خدا کی وصیت کے مطابق وصیت کرے، اور کسی وارث کے مقررہ حصہ میں کمی بیشی نہ کرے، تو یہ اس لئے لغو کہ بغیر وصیت بھی ورثا کو اسی قدر حصہ مل جاتا، تاہم اس لغویت کے باوجود وصیت کو مفروض الٰہی ماننے میں کسی کو عذر نہیں ہو سکتا۔ اگر موصی کی وصیت، خدا کی وصیت کے مطابق، اور "غیر مضار" کسی وارث کو نقصان پہنچانے والی نہ ہو، اور آپ کی قائم کردہ بحث سے بھی زیادہ سے زیادہ یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے وصیت والدین اور اقربین پہلے فرض کی تھی۔ اور اپنی وصیت یعنی ترکہ کی آیت میں والدین اور اقربا ہی کے لئے تقسیم کر کے اپنا اصول بتا دیا اس لئے اب اگر وصیت ہو سکتی تو خدا ہی کی وصیت کے مطابق۔

اس ضمن میں آپ کا سب سے زبردست اعتراض یہ ہے :-

"وارثوں کو محروم کرنے کے لئے محجوب کا افسانہ گھڑا گیا، جس کو قرآن کہیں حامی نہیں، محجوب کا لفظ تک بدعتی ہے، کہیں قرآن میں نہیں، مثلاً پوتا، پوتی، یتیم، بیکس، بے سرپرست، باپ کا سایہ سر سے اٹھا، ہر طرح مجبور، ہر طرح قابل رحم، ہر طرح قابل اعانت و دستگیری ہے، وہ بے قصور اور بے جرم ترکہ سے محروم کئے گئے۔ حالانکہ ولد میں داخل۔ اور باپ کے ترکہ کی باپ کی جگہ مستحق ہیں، اور "ذریت" میں بھی داخل، جو اوپر کی آیت میں مذکور ہوئی .... یتیم علما کے مظلوم ہیں" وغیرہ

پوتا پوتی، نواسا نواسی اگر ولد میں داخل ہیں، تو انہیں باپ یا ماں کی موجودگی میں بھی کوئی حصہ کیوں نہیں ملتا۔ مثلاً کسی کے اگر دو بیٹے اور ایک پوتا اور ایک بیٹی اور ایک نواسی ہیں، تو آپ کے اصول کے مطابق تین بیٹے اور دو بیٹیوں پر میراث تقسیم ہونی چاہئے، لیکن اگر یہ پوتا انہیں دونوں بیٹوں میں سے کسی کی اولاد ہے اور نواسی بھی اسی موجودہ بیٹی کی لڑکی ہے تو شاید اس صورت میں جناب بھی ہمت نہیں کر سکتے کہ پوتے کو باپ کے علاوہ اور نواسی کو ماں کے علاوہ، علیحدہ سے بیٹے اور بیٹی کا حصہ ملے۔ اس لئے کہ اس طرح تو

کوئی اصول ہی قائم نہیں ہو سکتا۔ اس سے صاف ظاہر ہو گیا کہ آیت میراث میں "ولاد" کو مراد خاص بیٹا بیٹی ہیں نہ کہ ان کی اولاد بھی۔ اب رہا امر کہ باپ کے ترکہ کی باپ کی جگہ مستحق ہیں تو یہ مجرد ایک قیاس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ تو یہ ہو کہ "اولادکم لا تدرون ایہم اقرب" بعض قرابتمندوں میں بعض بعض سے زیادہ حقدار ہیں، اور اس کے بیان کرنے کی کوئی حاجت ہی نہیں کہ پوتا پوتی، نواسی کے مقابلہ میں، بیٹا بیٹی زیادہ قریبی قرابتمند ہیں لہٰذا یہ شاخسانہ اللہ میاں کا نکالا ہوا ہے کہ بلا تخبر قرآن اسکا حامی۔ پوتا پوتی، نواسہ نواسی، کا علیحدہ سے کوئی حصہ بھی مقرر نہیں ....

جب وہ باپ یا ماں کی زندگی میں وارث نہیں ہوتے، تو ان کے مرنے کے بعد کیونکر وارث ہو سکتے ہیں، لیکن بھائی اور بہن تو ذوی الفروض ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے حصہ بھی مقرر کیا اور محجوب و محروم بھی کیا، یہ وارث اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ماں باپ بیٹا بیٹی نہ ہوں، ورنہ محجوب اور محروم، خود اسی سے محجوب کا قرآنی مفہوم ہونا ثابت ہے۔ آپ کی پیش کردہ آیت "ولیخش الذین لو ترکوا من خلفہم ذریۃ ضعافا خافوا علیہم فلیتقوا اللہ و لیقولوا قولا سدیدا" کو وصیت اور وراثت سے کوئی واسطہ تو نہ تھا کہ اس آیت میں سیاق و سباق کی رو سے صاف یتیموں کے اولیا کی طرف روئے سخن معلوم ہوتا ہے، لیکن آپ نے "العبرۃ لعموم اللفظ" یا بقول خود "لا تقربوا الصلوٰۃ" کے اصول پر استدلال فرمایا ہے۔ اس لئے مجھے تو اپنے اصول کے مطابق بلا عذر اس دلیل پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہے۔

لیکن خود آپ کے اصول کے مطابق آپ کا استدلال غلط ہے۔ بہرکیف تو آپ کہتے یہ ہیں کہ پوتا پوتی ذریت میں داخل ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ ذریت سے یہاں صرف وہی مراد ہیں، یعنی پوتا پوتی، نواسہ نواسی وغیرہ کو ذریت کا استعمال اولاد کے لئے بھی ہوتا ہے، مثلاً "رب ھب لی من لدنک ذریۃ طیبۃ" لیکن اولاد کی اولاد کے لئے کثیر الاشاعت ہے۔ جیسے "اولئک الذین انعم اللہ علیہم من النبیین من ذریۃ ادم و ممن حملنا مع نوح و من ذریۃ ابراہیم و اسمٰعیل و ممن ھدینا و اجتبینا" اور "ذریۃ بعضہا من بعض" علاوہ ازیں اگر یہاں ذریت سے مراد اولاد ہی ہو

اور اولاد کی اولاد مختصاً شامل، تو یہ دو وجہ سے لغو اور باطل، ایک تو وہی خرابی اور دشواری پیش آتی ہے کہ جن کا حصہ مقرر ہو چکا، ان کو وصیت کے ذریعہ مفروضہ خداوندی سے ناقص دینا، حدود خداوندی کو توڑنا ہے، دوسرے یہ کہ اس آیت سے وصیت کی تخصیص صرف اولاد ہی کے حق میں ہو جاتی ہے، اور یہ عقلاً بھی مہمل، کہ کیا اولاد کے سوا دوسرے ورثا کی پریشانی اور مجبوری کا خوف ہو، تو ان کے لئے وصیت نہیں ہو سکتی، اور آپ کے دعویٰ کی رو سے بھی غلط، کہ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقربا کے لئے وصیت فرض فرمائی ہے، نہ کہ صرف اولاد کے لئے، اور اس آیت کی رو سے صرف اولاد ہی کیلئے وصیت کی تخصیص ہو جاتی ہے کیونکہ ماں باپ، بھائی بہن، میاں بیوی، پر ہرگز ہرگز ذریت کا اطلاق درست نہیں ہو سکتا، لہذا اس آیت میں پوتا پوتی، نواسہ نواسی وغیرہ کی طرف ہی روئے سخن ہے، کہ اولاد کا حصہ تو بیان ہو چکا، اولاد کی اولاد کا کوئی حصہ مقرر نہیں کیا گیا، انھیں حصہ ملتا، تو اپنے باپ یا ماں کے حصہ سے اور وہ باپ یا ماں کے مرجانے سے "اولوا الارحام بعضہم اولیٰ ببعض" کی بنا پر محجوب ہو گئے، تو خداوند عالم اور ارحم الراحمین نے ان کے لئے نہایت موثر الفاظ اور پر زور طریقہ پر ہدایت فرمائی کہ انھیں وصیت کے ذریعہ سے کچھ دیدو، کہ وہ ہر طرح قابل رحم ہیں، اور اعانت و دستگیری کے مستحق، اور تمہاری ہی نسل و اولاد سے ہیں، اور شاید ترکہ کی تقسیم میں "من بعد وصیۃ" سے وصیت کی رخصت اسی غرض خاص کی بنا پر دی گئی ہو، گویا یہ آیت، آیت وصیت کی موید نہیں، بلکہ اس سے بھی محجوب کا شاخسانہ نکلتا ہے

یہ تو اچھی طرح ثابت ہو گیا، کہ محجوب کا مفہوم یکسر قرآنی ہے، اور قرآن اس کا ہر طرح حامی، یہ اعتراض البتہ زبردست ہے کہ محجوب کا لفظ تک بدعتی ہے، تو بدعتی خود کون سا قرآنی لفظ ہے، اگر محجوب کا لفظ اس لئے بدعتی ہے، کہ یہ لفظ قرآن میں نہیں، تو اس اعتبار سے بدعتی بھی بدعتی لفظ ہے، اور آپ کی ساری کتاب اس طرح کی بدعت سے مملو۔

یہاں جناب مصنف کی ایک غلطی کی طرف بھی اشارہ کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ آپنے آیت وصیت

"ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین" کو اردو کی شق یا "ترک الوالدان و الاقربون" پر قیاس کر کے "للوالدین والاقربون" لکھدیا ہے، حالانکہ یہ عطف ہے والدین پر، جو حالت جر میں واقع ہے، اور جمع کا اعراب حالت نصب اور جر میں "ی" کے ساتھ ہوتا ہے، اس غلطی کو غلطی کاتب اور سہو کتابت پر بھی محمول نہیں کیا جا سکتا، کہ غلط نامہ میں ایسی اہم غلطی کی اصلاح کیوں نہ کی گئی۔

اور پھر یہی تکرار اسی غلطی کے ساتھ دوسرے صفحہ پر یوں درج ہے، کہ آیت وصیت میں حکم دیا تھا للوالدین والاقربون" اور یہی غلطی اسی صفحہ پر "لکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون کی ترکیب کرتے ہوئے یوں کی گئی ہے۔ لکل الوالدین والاقربون جعلنا ورثاء مما ترکوا"۔ حالانکہ اس کی ترکیب یوں ہونی چاہئے "لکل الوالدین ولکل الاقربین جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون"۔ اصل یہ کہ جس طرح آپ اردو میں "والدین اور اقربون" لکھتے چلے گئے اسی طرح عربی کی بھی آپ نے تصحیح کر دی "ما ترک الوالدان والاقربون" پر لکل الوالدین والاقربین" کو بھی آپنے قیاس فرمالیا، ذلک مبلغہم من العلم۔

(باقی)

مقالات

سیرت شبلی

(۹)

از جناب مولانا اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے علیگ

اس کے بعد مولوی بہادر علی ایم۔ اے نے مولوی داؤد بھائی رکن لجنۃ الادب کا عربی قصیدہ اپنے مخصوص عربی لہجہ میں پڑھا۔ پھر مولوی نذیر احمد بی۔ اے نے عربی زبان میں ایک تقریر کی۔ اس کے بعد ولایت اشرف خاں طالبعلم بی۔ اے کلاس نے جو بعد کو ڈپٹی کلکٹر صوبہ متوسط ہوئے اور پنشن لیکر اب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر ہیں حسب ذیل نظم پڑھی۔

آج یہ کیوں نظر آتے ہیں خوشی کے ساماں
در و دیوار سے آثار مسرت ہیں عیاں

زیب و زینت نہیں کچھ ایک جگہ پر موقوف
ساری دنیا نظر آتی ہے مجھے باغ جناں

دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھپا جاتا ہے
دل کو بھاتا ہے بہت آج کے دن کا یہ سماں

ہر طرف دیکھئے سبزے کی بہار دلکش
فرش اطلس کا مجھے ہوتا ہے ہر لحظہ گماں

جس طرف جائیے غنچے ہیں تبسم بر لب
اور جدھر دیکھئے گلہائے چمن ہیں خنداں

دھوم صحرا میں ہے جنگل میں ہے منگل کا سماں
آج ویرانے کا معدوم ہے دنیا سے نشاں

ہیں بلند آج ہر اک لب سے خوشی کے نعرے
شاد و خرم نظر آتا ہے ہر اک پیر و جواں

دست قدرت نے گہربار جو ہونا چاہا [۱]
ابر آیا و رشہوار سے بھر کر داماں

۱ اتفاق سے عین جلسہ کے وقت چھینٹا سا ہو کر چھڑکاؤ ہو گیا تھا۔

نہ رہی شکل وہ دنیا کی نہ مافیہا کی
کچھ سے کچھ کر گئی اک بارش ابر باراں

دشت و صحرا ہوئے گلزار بہار آ پہنچی
رشحۂ ابر سے سرسبز ہوا باغ جناں

سر کے بل آ گئے ہی بڑھتی تھی نگاہ پر شوق
اس تماشے پہ تھیں سو جان سے آنکھیں قرباں

سخت حیرت تھی خدایا یہ خوشی ہے کیسی؟
جا رہا تھا میں اسی فکر میں غلطاں پیچاں

ناگہاں کان میں آواز یہ آئی میرے
باعث غور ہے کیا کیوں ہوئے ایسے حیراں

خیر ہے فکر یہ کیسی ہے تعجب کیسا!
مہرباں ہوش میں آؤ ہو تم اسقدر کہاں

جشن نوروز ہے اک دھوم مچی ہے ہر سو
کچھ وہاں چلنے کا بھی تم نے کیا ہے ساماں

یہ صدا کان سے پہنچی جو اتر کر دل میں
ہو گیا مجھ پہ عیاں صاف یہ سب راز نہاں

دیکھنے کو جو بہت میری طبیعت چاہی
ساتھ سب لوگوں کے اس سمت ہوا میں بھی رواں

لے جاتا تھا وہاں شوق مجھے ہاتھوں ہاتھ
جا رہا تھا میں نہایت خوش و خرم شاداں

چشم مشتاق جسے ڈھونڈھ رہی تھی ہر سو
مجھکو دکھلائی دیا دور سے ناگہ وہ مکاں

خوشنما دلکش و دلچسپ تھی جس کی تعمیر
جس کی صورت سے نمایاں تھی بہت شوکت و شاں

پاس جا کر جو نظر کی تو وہاں پائے بہم
ہند کے جملہ ارا کین و مشیر و اعیاں

عقل و دانش کو ہوئی جس کے سبب زینت حاصل
عزت و شان کی جن سے کہ بڑھی عزت و شاں

عدل [۲] سے جن کے ممالک ہوئے معمور تمام
جن کے ہاتھوں سے یہ سرسبز ہوا ہندوستاں

بانیٔ پرورش علم و ہنر نے جن سے
ہے بجا جھکو اگر کہئے کہ میں ہند کی جاں

ناگہاں ایک خوشی ہوئی سب پہ طاری
جبکہ دربار میں نافذ ہوا شاہی فرماں

بہر تعظیم کھڑے ہو گئے حضار تمام
ہو گیا پھر ہمہ تن گوش ہر اک پیر و جواں

سن کے کچھ پھول گئے مارے خوشی کے اعضا
دل سے مت پوچھئے کچھ حظ مسرت کا بیاں

۲ یہ تھے جذبات جن کی تربیت علی گڑھ کی فضا میں کی جاتی تھی۔

ہوئے شمس العلما آج جناب شبلی — چار سو ہوگیا اس مژدہ کا فوراً اعلاں
فخر کرتا ہے بہت جن پہ علیگڑھ کا لج تو — بلکہ یوں کہئے کہ ہے ہند بھی جن پر نازاں
مصر اور شام خجل ہیں عربی سن کے اگر — فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہے ملک یوناں
فارسی کی جو بھنک کان میں پڑ جائے کبھی — پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں
تم کو شمس العلما کا یہ مبارک ہو خطاب — جب تلک شمس رہے اوج سما پر رخشاں
پس دعا ہے یہ ولایت کی ہمیشہ یا رب — یہ لقب پھولے پھلے آپکے زیر داماں

سبز و شاداب رہے جب تک کہ رہے باغ علوم
شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر پہ تاباں

اس نظم کے بعد ممتاز حسین صاحب نے جو اس وقت ایف اے میں پڑھتے تھے۔ اور مجلس اخوان الصفا و بحث الادب کے ممبر تھے عربی میں تقریر کی۔ پھر مولانا کے ماموں زاد بھائی اور سرمایہ ناز شاگرد حضرت علامہ حافظ حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے جو اس وقت بی اے میں پڑھتے تھے حسب ذیل عربی قصیدہ پڑھا۔

یا خیر من یسمو الی العلیاء — کالشمس بازغة بوسط سماء
قد کنت قدما للمعالی سامیا — اورثته عن شیمة الآباء
فلئن سموت الی المکارم والعلی — فلقد نشأت بعزة قعساء
لا غرو نسل السیف ان یک ماضیا — او یستهل البرق بالالاء
فلانت بالعزمات سیف صارم — ولانت برق لامع بسناء
لاذت بجانبک العلوم فانها — لو لم تصنها آذنت بفناء
قد امحلت ارض العلوم وصیحت — عرصاتها کسمائق البیداء
فجعلت تمطرها بسح واکف — صوب الربیع بدیمة هطلاء

فربت ریاض العلم منک وانبتت — مهتزة بغصونها الخضراء
کم معضلات فی المسائل قد ابت — ان یکشفوا عنها ذوو الآراء
مزقت استارها فتمزقت — کالبرق یهتک سدفة الظلماء
علمتنا سبل الرشاد وانما — کنا کخابط لیلة لیلاء
کنا بمجهلة یخاف بها الردی — فهدیتنا لمحجة بیضاء
فلنشکرنک من صمیم قلوبنا — بشکر الجلیل بثنه سراء
فلنسأل الله طول بقاءکم — فی کل بکرتنا وکل عشاء
واهنئنکم بما اعطیتم — من خیر ما وجدوا من الاسماء
ان کان تلک الشمس شمس سمائها — فلصرت شمس العلم والعلماء

اذ انت شمس والعلوم سماؤکم
فالشمس شمسی والسماء سمائی

اس قصیدہ کے بعد خواجہ غلام الثقلین اور محمود صاحب نے اردو میں تقریریں کیں پھر پنجاب کے مایۂ ناز شاعر مولانا ظفر علی خاں نے جو اس وقت بی اے میں تھے اور اخوان الصفا کے رکن تھے، حسب ذیل فارسی قصیدہ پڑھا۔ دیکھئے خامیوں کے باوجود قصیدہ کے تیور اسی وقت سے بتا رہے ہیں کہ یہ نونہال آگے چلکر چمن ادب کا سرو رعنا ہونے والا ہے۔

سحرگاہاں دلم پامال غم بود و پریشانی — کدر مطلع خاطر بد از اندوہ پنہانی
گہے بر بے سروسامانی خود نالہ می کردم — گہے خواندم حدیث گردش ایام طولانی
گہے بر کردۂ خود انفعالم دست می داد — گہے کردہ نظر بر معصیت خوردم پشیمانی
چو موج غم ز سر بگذشت گشتم عازم گلشن — کہ در ان دل نزارم شود ز انسان بآسانی

شگفتہ غنچۂ دل شد ز فرط فرحت و بہجت | عروس دہر را پیرایہ دیدم چو نورانی
گل و بلبل بہم محو ادا و عشوہ و غمزہ | چو زلف مہوشاں گیسوئے سنبل در پریشانی
خرام نازک کبک و رقص سرو و خندۂ گلہا | دلم بردہ شدہ روحم نثار صنع یزدانی
دمیدہ لالۂ حمرا کنار جوئے کوثر وش | ہمی شد از جمالش غرق خوں لعل بدخشانی
وزیدہ از گلستاں باد صبا آہستہ آہستہ | مشام جان معطر شد ز بوئے مست ریحانی
گل نسریں عذار و ارغوان و نرگس و سوسن | بہ ہر یک عشوہ ہا خاصے بہ انداز ارزانی
ز شبنم لالہ داغ خود بہ آئین نکو شستہ | شمیم شنبلید و یاسمن در عنبر افشانی
ہزاراں مرغ خوش الحاں نشستہ بر سر اغصاں | بہ صوت دلربا بودند محو تہنیت خوانی
مہ نو گشتہ بہر نثار از نقرہ پر کردہ | کواکب بر فلک مصروف ہر سو در دُر افشانی
چوں ایں نظارہ را دیدم بجیب فکر سر بردم | کہ بہر کیست ایں آرائش و تزئین لاثانی
دریں اثنا مرا از ہاتف غیبی ندا آمد | نمیدانی مگر تو اے غریق بحر حیرانی
کہ فخر قوم مولانائے شبلی را پئے علمش | خطابے شد عطا امروز ز فیض جود سلطانی[1]
زمین ہم آسماں ہم چہرہ افروزند بہر او | معطر باغ دہر است از پئے شبلی نعمانی
بحمد اللہ کہ در درج حکمت رایس از عمرے | ز عدل خسروی شد گرم بازار درخشانی
نہ یارائے ثنائے تو قلم را نے زبانم را | قطار عالماں انجم میانش شمس تابانی
کنند اے کان معنی علم و فضل و دانش و حکمت | بہ یک پا ایستادہ در جنابت آستاں بانی
زمین شعر از فیضت پر از گلہائے گوناگوں | سخن را دادہ سرمایہ بحر سخندانی
کند بنائے مضمون لطیف و خوش بکلام طے | سمند کلک تو ہرگہ شود سرگرم جولانی
برائے داد از فکر خود عرفی و صائب را | کجا ہم پایہ ات باشند خاقانی و قاآنی

[1] یہ لطیف اشارہ اصلی سبب عطائے خطاب یعنی تمغۂ مجیدیہ کی طرف ہے۔

بہاراں تغزل باشد ز گلزار کمال تو | ز بحر عقل و فہمت رشحۂ ابر است نیسانی
خداوند کریمت لحن داؤدی عطا کردہ | کنی تسخیر دلہا چوں کنی ترتیل قرآنی
نوائے نغمہ ہائے شکریں تا خیزد از لبہیں | صدائے بلبل آید تا ز شاخ سرو بستانی

ز چشم زخم دوراں در سلامت باشی ایمن
معین و یاور و ناصر ترا تائید ربانی

ظفر علی خاں یہ نظم پڑھ چکے تو لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی شاگرد غالبؔ جو مولانا حالی کے ساتھ تشریف لائے تھے ایک تقریر کی جس کے بعد خود مولانا حالی نے یہ عربی قصیدہ پیش کیا۔

یا وحیداً من الکرام فریداً | و عزیزاً کمثل علق نفیس
انت اولی بان تلقب شمساً | بل بان یجعلوک شمس شموس
انت شمس الهدى ولست بشمس | یعتریها الخنوس بعد خنوس
انت طهرت ذیل دین مبین | لوثته الاثام بالتدلیس
ثم دافعت عن امام تقی | کان بعد النبی خیر رئیس
وعن الحق قد کشفت غطاءً | بعد ما اغلفوه بالتلبیس
سرت انت فی الارض یرادها | المعالی ولا لامر خسیس
قلدوک التلامذ مدارس قوم | فیه یرجی لهم کمال النفوس
فتقلدت والتزمت لزوماً | خدمة المسلمین بالتدریس
قمت بالدرس والدراسة فیهم | فارغاً عن رياسة وریش

وجعلت الکمال غاية بغیتهم
واتخذت الکتاب خیر جلیس

علامہ شبلی کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ ۲۶-۲۷ برس کی تھی نواب محسن الملک اور مولانا حالی بہ لحاظ سن وسال مولانا سے بہت بڑے تھے اور بلحاظ فضل وکمال بھی ہر طرح قابل احترام تھے بلکہ اس وقت سے صاحب فضیلت شمار ہوتے تھے جبکہ مولانا شبلی غالباً طفل مکتب بھی نہ رہے ہوں۔

ایسے ایسے ہزار خطابات ایک طرف اور ان بزرگواروں کی زبان سے ایک کلمۂ ستائش ایک طرف۔ مولانا حالی اپنا قصیدہ ختم کر چکے تو مولانا شبلی تشکر وسپاس مندی کے جذبات سے سرشار اٹھے اور ان نکتہ شناس احباب کی عزت افزائی کے شکریہ میں حسب ذیل تقریر کی۔

"آپ نے جس مہربانی اور محبت سے عطائے خطاب کی تقریب میں مجھکو مدعو کیا ہے اور جس جوش اور خلوص سے اس موقع پر مجھکو مبارکباد دی ہے۔ اس کا شکریہ میں نہایت سچے دل سے ادا کرتا ہوں۔ حقیقت میں میرے لئے اس سے زیادہ فخر اور عزت کا کیا موقع ہو سکتا ہے کہ مجمع الادب کا جو اپنی قسم کی تمام ہندوستان میں ایک مجلس ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اس مقدس زبان میں ہم تقریر کرنا سکھائے جو ہماری مذہبی اور قومی زبان ہے جس کے ارکان میں مولوی بہادر علی صاحب ایم اے اور کیسے ایم اے ڈبل ایم اے اور داؤد بھائی جیسے ادیب، فضل اللہ خاں صاحب رئیس، جناب حاجی اسمٰعیل صاحب ممبر کونسل، جناب سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، مولوی خلیل احمد صاحب ایم اے، اور اس کے اعزازی ارکان میں ہمارے مخدوم مولانا حالی صاحب داخل ہیں۔ میرے لئے خطاب کی نسبت مبارکباد دینا ایک ایسا فخر اور ایک ایسی عزت ہے جس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے! اسی طرح اخوان الصفا کی مجلس جو مسلمانوں کی اس قدیم مجلس کے نمونہ پر قائم کی گئی جو [illegible] میں قائم ہوئی تھی جس کے سکرٹری میرے استاد اور ہمارے کالج کے فرشتہ خصال پروفیسر مسٹر آرنلڈ ہیں اور جس کے ممبر نہایت پاکیزہ اخلاق اور لائق و فائق شخص ہیں ایسی مجلس کا مجھکو مبارکباد دینا بڑی سے بڑی عزت اور بڑے سے بڑا شرف ہے۔ اے حضرات!

اگرچہ میں انگریزی گورنمنٹ کی نہایت قدر و عزت کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس کے تمام احکام اور قواعد سیاست اور انتظام کے اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہیں اور اس بنا پر اس خطاب کی بھی جو گورنمنٹ نے مہربانی سے مجھکو عطا کیا ہے نہایت قدر و منزلت کرتا ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اس خطاب کی جو قوم کی طرف سے دیا جائے گورنمنٹ کے خطاب سے کچھ کم عزت نہیں رکھتا اور یہ میرے کچھ بیجا بات نہیں بلکہ اس زمانہ میں بھی جبکہ خود مسلمانوں کی حکومت تھی، مسلمانوں نے ہمیشہ سلطنت کے خطابات کی نسبت قومی خطابات کی زیادہ عزت کی، اسی کا اثر ہے کہ سلطنت عباسیہ اور دوسری سلطنتوں کے عطا کئے ہوئے خطابات بالکل معدوم ہو گئے۔ اور قوم کے عطا کئے ہوئے خطابات یعنی حجۃ الاسلام غزالی کے لئے، امام فخرالدین رازی کے لئے، علم الہدیٰ شریف مرتضیٰ کے لئے آج بھی باقی اور قائم ہیں۔ پس جب میں دیکھتا ہوں کہ گورنمنٹ نے جو خطاب عطا کرنے کی عزت مجھکو دی ہے، اس کو آپ لوگ جو قوم کے صحیح قائم مقام ہیں پسند کرتے ہیں اور اونچا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھکر میرے لئے فخر اور خوشی کا کیا موقع ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یکم جنوری کو اگر گورنمنٹ کے حضور سے مجھکو یہ خطاب ملا تھا تو آج ۱۶ جنوری کو مجھکو قوم کے دربار سے [illegible]

ایں کہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب

اے حضرات! جس طرح میں نہایت سچے دل سے آپ صاحبوں کی مہربانی کا شکریہ ادا کرتا ہوں میرا فرض ہے کہ گورنمنٹ کی اس پالیسی کی نسبت احسان مندی کا اظہار کروں جو اس نے اس خطاب کے دیئے جانے کی نسبت اختیار فرمائی ہے۔ حضرات! آپ کو معلوم ہے کہ جب کسی ملک میں انقلاب حکومت ہوتا ہے تو نئی حکومت پرانی حکومت کے تمام آثار کو، علوم کو، فنون کو، تہذیب کو، تمدن کو مٹا دینا چاہتی ہے۔

قال اللہ تعالیٰ۔ جعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ وکذلک یفعلون۔ لیکن[1] انگریزی حکومت نے بخلاف اس کے پرانی حکومت یعنی اسلامی حکومت بلکہ ہندوؤں کی حکومت کے آثار کو بھی محفوظ رکھنا چاہا ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی نے جو کام کیا ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ قدیم عمارتوں کی نسبت جو کچھ اہتمام گورنمنٹ نے

[1] کاش وہ قدر بھی پوری نہیں ہوئی۔

وہ بھی نہیں، اسی طرح گورنمنٹ نے اس خطاب کے سسٹم کو قائم کرنے سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ قدیم تعلیم اور قدیم علوم کی ویسی ہی عزت کرتی ہے جس طرح کہ انگریزی کی۔ حضرات! اگرچہ کسی ایسے شخص کو جو علم کی خدمت کرنا چاہتا ہے، کسی قسم کے خطاب کی خواہش کرنی یا خطاب کو اپنی خدمت کا صلہ سمجھنا ایک قسم کی تنگ حوصلگی ہے۔ اور اسی بنا پر ہمارے قدیم بزرگوں میں سے بہتوں نے اس قسم کے خطابات قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، تاہم کچھ شبہ نہیں ہے کہ اس قسم کے اعزاز سے لوگوں کے حوصلے بڑھتے ہیں اور ان کی ہمت بلند ہوتی ہے۔ ہم کو گورنمنٹ کے سایہ عاطفت میں اس بات کا موقع حاصل ہے کہ ہم اپنے قدیم علوم، قدیم زبان، قدیم تہذیب کو محفوظ رکھیں اور اگر ہم کو ایسا کرنے کے لئے قدردانی اور ظاہری اعزاز کی تمنا و آرزو ہے تو گورنمنٹ ہماری قدردانی اور عزت افزائی کے لئے اسی طرح موجود ہے جس طرح اسلامی عہد میں اسلامی حکومت — مولوی عبدالحق صاحب خیرآبادی، مفتی میر عباس صاحب، مولوی حامد حسین صاحب اگر اسلامی حکومت کے زمانہ میں ہوتے تو ان کو اسی قسم کے اعزاز کی توقع ہو سکتی تھی جو انگریزی گورنمنٹ نے آپ کو عطا کیا۔ حضرات! جبکہ میں اس موقع پر آپ کے اور گورنمنٹ کے احسانات کا شکریہ ادا کرتا ہوں تو نہایت ناسپاسی ہوگی اگر میں اس چیز کا[۵] ذکر نہ کروں جو ان تمام احسانات کا اصلی سرچشمہ ہے یعنی ہمارا کالج"۔

اس پرائیوٹ تقریب کے بعد ۱۷ فروری کو اسٹریچی ہال میں باضابطہ جلسہ ہوا جس میں عطائے خلعت و خطاب کی رسم سرکاری طریقہ پر ادا کی گئی۔ مسٹر ہنری گنگھٹن کمشنر قسمت میرٹھ نے خلعت اور تمغہ مولانا کو دیا۔ اور سرسید نے اپنے محترم ہاتھوں سے خلعت پہنایا۔ جس کے بعد کمشنر صاحب نے حسب ذیل تقریر کی۔ چونکہ اس تقریر میں کمشنر صاحب نے صاف گوئی سے کام لیا ہے اور عطائے خطاب کے اسباب اور اس کی غرض و غایت پر علمی کے زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی ہے۔ لہٰذا ہم پوری تقریر کا ترجمہ ذیل میں درج کر دیتے ہیں۔

"مولوی شبلی نعمانی! مجھے اس امر کی نہایت خوشی ہے کہ یہ سند اور خلعت گورنمنٹ آف انڈیا

---

[۵] یہاں اصلی جذبات کا اظہار ہے۔

اور گورنمنٹ صوبہ جات ہذا کی طرف سے ایسے وقت میں آئے کہ مجھ کو اس مسرت اور خصوصیت حاصل کرنے کا موقع ملا کہ میں بذات خود اس رسم میں شریک ہوں جو اس عطیہ خطاب کی غرض سے کی گئی ہے۔ جس کے لئے یہ سند اور خلعت ثبوت اور علامت ہے۔ اس خطاب کی تاریخ لارڈ ڈفرن کی اس عبارت سے معلوم ہوتی ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ کیونکر ۱۸۸۷ء میں یہ قائم کیا گیا۔ ہز اکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے اس امر پر توجہ فرمائی تھی کہ اب تک کوئی ایسا مناسب ذریعہ موجود نہیں جس سے ہم ان ہندو مسلمان اشخاص کی اعلیٰ لیاقت کی قدرشناسی کر سکیں جو ہز مجسٹی حضور پر نور قیصر ہند کی وفادار رعایا میں موجود ہوں۔ اور نیز ان کو اس امر کی خواہش تھی کہ جشن جوبلی کی یادگار قائم رکھی جائے۔ پس انھوں نے ایک نئے خطاب کی تجویز کی جو ان ہندو مسلمان اشخاص کو عطا کئے جائیں جنھوں نے علوم شرقی کی ترقی میں کارہائے نمایاں کئے ہوں۔ ہز اکسلنسی وائسرائے اور گورنر جنرل نے ہدایت فرمائی ... کہ یہ خطاب شخص مخاطب کے نام کے اول میں اضافہ کیا جائے گا ... خطاب شمس العلما کے ساتھ ایک خلعت بھی عطا کی جائے گی جس میں ایک عمامہ اور ایک عبا ہوگی۔ جن اشخاص کو شمس العلما کا خطاب عطا ہوگا وہ دربار میں ان اشخاص سے متصل ہی درجہ پر بیٹھیں گے جن کو نواب کا خطاب ہوگا۔ شمس العلما مولوی شبلی نعمانی! اس رسم خلعت کے انجام دینے پر اور اس سند کے نذر کرنے کے ساتھ جس پر ایسے قابل اور عالی دماغ اور راستباز وائسرائے اور گورنر جنرل کا طغرا ہے جس سے بہتر ہندوستان کی خوش قسمتی کے حصہ میں نہیں آیا۔ آپکو تبریک دیتا چاہتا ہوں کہ آپ کی عمر دراز اور جاودانی ہو۔ نہ صرف اس لئے کہ اس شایان شان اعزاز سے لطف اندوز ہوں بلکہ اس واسطے کہ جس طرح ترقی علوم شرقیہ میں آپنے ایسے کارہائے نمایاں کئے ہیں جن سے یہ امتیاز حاصل کیا اسی طرح اس سے بھی زیادہ نمایاں خدمت اپنی قوم اور انگلش[۱] قوم کے واسطے کرتے رہئے۔ جس کے ساتھ عروج کرنا آپ کی قوم کے لئے مفید[۲] ہے۔ اور اپنے پر زور اثر کو جو آپ کی

---

[۱] افسوس یہ آرزو اور حسرت کبھی پوری نہ ہوئی۔ [۲] نعوذ باللہ منہا۔

لیاقت سے پیدا ہوتا ہے، ہیں جو زمانہ کے استحکام اور توسیع کی طرف مائل ہیں جس کو اپنے پرنسپل کے دلپسند الفاظ اور برٹش حکومت کی وفاداری انگلش کلچر اور مسلمان رواج کے بلند اور روزافزوں خیالات) کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں۔ یہی تین باتیں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علیگڑھ میں ایسی ہیں جن کو اس کی علامت اور اثر قدیم اور اس کی روح کہہ سکتے ہیں۔ او جو اپنی مثال اور اثر سے ہندوستان بلکہ دنیا پر اس سچے اصول کا اظہار کر رہی ہیں جس سے ایک قومی گر زوال یافتہ قوم اپنی تلف کردہ عظمت کی بنیاد ایسے انداز پر ڈال سکتی ہے جو اس کے لئے باعث عزت اور اس کے فرمانرواؤں کے لئے باعث ہمدردی اور اعانت ہو سکے۔ اس کالج اور اس کے پیارے لائق اور بانی کی نسبت میں دل سے چاہتا ہوں کہ یہ کالج ایسی متصل اور مستقل ترقی کے ساتھ استحکام کے مدارج حاصل کرتا جائے کہ اس کے بانی کی درخشاں زندگی کے افق پر کالج کی آئندہ حالت کے خیال سے پریشانی کا ابر نہ چھائے اور اس کے آخری ایام مسرت کے روشن افق پر بسر ہوں۔ جہاں فرحت بخش امید کا جلوہ ہے اور جہاں کامیابی کا میدان سامنے نظر آتا ہے، جہاں اس کی آنکھیں ارض موعود کو دیکھکر جس کی جانب وہ اپنی قوم کی رہبری کرتے ہیں اس طرح پر روشن ہوں جیسا قوم بنی اسرائیل کے اس بڑے فدائی کی چشم تر میں ہو رہی تھی۔ جس نے اپنی زندگی کو اس بات پر صرف کر دیا تھا کہ قوم کو کشور غلامی سے باہر نکالے۔"

علامہ مرحوم کی نسبت گورنمنٹ کے اس اعتراف کمال کو نہ صرف کالج بلکہ ملک کے ہر گوشہ میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بالعموم اکابر قوم نے مولانا کو اس خطاب پر مبارکباد دی۔ مولانا نے ان سب کے شکریہ میں ایک تحریر شائع کی جس سے نکتہ رس نگاہ کو صاف نظر آجائے گا کہ اس خطاب کی نسبت خود مولانا کے جذبات کیا تھے۔

"عطائے خطاب کی تقریب میں اکثر بزرگان قوم نے مبارکبادی کے جو خطوط لکھے اور جس مرتبہ و حالت سے بدرجہا بڑھکر جن الفاظ میں قدردانی کا اظہار کیا ان کا اثر اگرچہ یہ نہیں ہو سکتا کہ

میں ایاز قدر خود بشناس کا مقولہ بھول جاتا تاہم کچھ شبہ نہیں ہے کہ وہ تحریریں میرے دائمی شرف اور عزت کی باعث ہیں اور میں ان بزرگوں کا جس قدر شکریہ ادا کروں کم ہے۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں اور آج بھی جہاں اسلامی حکومت ہے وہاں کی حکومت کے عطا کردہ خطابات سے قومی خطابات کی عزت زیادہ کی جاتی ہے اس لحاظ سے میری عزت افزائی کی نسبت ان بزرگان قوم کی طرف سے پسندیدگی و خوشی کا اظہار جو ہماری قوم کے جائز قائم مقام ہیں اور جن میں افتخار الدولہ فخر الملک صاحبزادہ محمد عبید اللہ خان بہادر فیروز جنگ سی ایس آئی نائب ریاست پٹیالہ، سردار محمد حیات خان بہادر سی آئی ای، نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب، نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین کے مبارک نام شامل ہیں۔ سب سے بڑی عزت ہے جو مجھکو عطا کی جاسکتی ہے۔ علی الخصوص لسان الملک فخر قوم مخدوم قوم مولانا الطاف حسین صاحب حالی دام مجدہٗ کی نظم جو جناب موصوف نے اس موقع پر لکھی ہے میرے لئے تمغائے فخر اور سند عزت ہے، بے شبہ یہ وہ بڑی سے بڑی عزت ہے جو مجھکو حاصل ہو سکتی تھی اور جس کے حاصل ہونے پر مجھکو اور کسی عزت کی خواہش نہیں ہو سکتی۔"

(باقی)

دیوان حمید (فارسی)

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ کا فارسی دیوان ہے۔ مولانا فارسی زبان کے ایسے ماہر تھے کہ خود اہل زبان ان کی فارسیت پر رشک کرتے تھے۔ مولانا شبلی رحمۃ اللہ جنکی فارسی شاعری پر زمانہ کا اتفاق ہے۔ اپنے ایک دوست کو مولانا حمید الدین کا ایک قصیدہ تحفۃً بھیجتے ہیں اور لکھتے ہیں "میاں حمید کا ایک قصیدہ بھیجتا ہوں۔ فارسی زبان اس کا نام ہے" جذبات و خیالات کے اعتبار سے حافظ کی شوخی اور پاکیزگی مولانا کی شاعری کی خصوصیت ہے۔ مدت ہوا یہ دیوان چھپا تھا۔ اب صرف چند نسخے رہ گئے ہیں۔ اہل ذوق منگا سکتے ہیں۔ قیمت ۲/

"منیجر مکتبہ حمیدیہ"

اشتراکیت پر ایک سرسری نظر

از ناصر اصلاحی

عہد جدید کی ڈیماکریسی کی معراج آزادی و سیاسی مساوات ہے اور کہنا چاہیے کہ یہ ہماری اجتماعی زندگی کا روشن پہلو ہے لیکن اسی کے ساتھ اقتصادی عدم مساوات کی ایک کھٹک ایسی ہے جس سے ایک مدت سے دنیا کی بے چینی بڑھتی جاتی ہے اور اب اس نے بڑھتے بڑھتے ہماری اجتماعی و سیاسی زندگی میں ایک ایسی لاینحل گتھی پیدا کر دی ہے کہ ہماری اجتماعی عقل اس کو سلجھانے سے اب تک عاجز ہے۔ یہاں تک کہ بعض ممالک میں اس کا جو حل پیدا کیا گیا ہے، اس کے متعلق بھی اب تک دنیا یکسو ہو کر یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ یہ مشکل کا حل ہے یا اس میں چند گرہوں کا اور اضافہ!! اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملہ نے قبل از وقت ایک علمی و اقتصادی نظریہ سے گذر کر سیاست کی دنیا میں قدم رکھ دیا ہے اور معلوم ہے کہ جو باتیں ساحل پر بیٹھ کر سوچنے بچارنے کی ہوتی ہیں ان کے لئے سمندر کی تلاطم اور امواج سطح کچھ موزوں جگہ نہیں۔ تاہم وقت کا فیصلہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو پیش نظر رکھا جائے۔ معلوم نہیں کب وہ وقت آجائے کہ ان کو ہماری زندگی سے نہایت گہرا تعلق پیدا ہو جائے اور ہم بالکل غافل ہوں۔ پس ہم آج کی صحبت میں چاہتے ہیں کہ پہلے اشتراکیت کے تخیل کا ابتدائی خاکہ بالاجمال پیش کر دیں اس کے بعد انشاء اللہ ہم اس پر بعض تنقیدی اشارات بھی کریں گے۔

اقتصادی عدم مساوات دنیا کی پوری تاریخ میں ہمیشہ نمایاں رہی ہے لیکن اس کی موجودہ شکل انیسویں صدی کی صنعتی ترقیوں کا نتیجہ قرار دی جاتی ہے۔ وہ ترقی جس نے سوسائٹی میں دو بڑے طبقے نمایاں کر دیئے۔ ایک طبقہ سرمایہ داروں کا جو بے انتہا منافع سمیٹ رہا ہے، دوسرا طبقہ مزدوروں کا

جو بازار کے تمام جزر و مد اور اتار چڑھاؤ کا ہدف ہے۔ اور تجارت و صنعت پر جو برے اثرات طاری ہوتے ہیں، ان کی ساری مضرتیں اسی کے حصہ میں آتی ہیں۔

سرمایہ داری کے پیدا ہونے کے دو بڑے اسباب بتائے جاتے ہیں۔

۱۔ وہ اقتصادی اصول جن کی علمائے اقتصادیات نے اٹھارہویں صدی میں اشاعت کی اور جو یورپ میں انیسویں صدی کے نصف اول سے عملی صورت اختیار کرنے لگے۔

۲۔ وہ حیرت انگیز صنعتی ترقیاں جو انیسویں صدی میں اختراعات و ایجادات کے جلو میں نمودار ہوئیں اور جن کی حمایت میں علمائے اقتصادیات نے تجارتی و صنعتی آزادی کا وعظ کہا۔ لیکن اس آزادی کا تمام فائدہ صرف سرمایہ داروں کو حاصل ہوا۔ مزدور اس سے بالکل محروم رہے۔ کیونکہ وہ غریب اس قابل نہیں تھے کہ سماج کے اندر اپنا مجموعی پوزیشن قائم کر کے اس آزادی سے فائدہ اٹھا سکیں اور اپنے حقوق اور اپنے مستقبل کو محفوظ کر سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس صنعتی ترقی نے جتنی دولت اگلی وہ سب کی سب ان چند سرمایہ داروں کے صحنوں میں جا کر جمع ہو گئی جو کارخانے قائم کر سکتے تھے، آلات خرید سکتے تھے، مال تیار کرا سکتے تھے یا تجارتی مقابلوں کی گھوڑ دوڑ میں بڑی بڑی بازیاں لگا سکتے تھے۔ اس طرح ان کو اپنے اس بات کا موقع مل گیا کہ مزدوروں کو طرح طرح سے ستائیں، ان کی مزدوریاں گھٹا دیں، کام کے اوقات بڑھا دیں، یہاں تک کہ سوسائٹی کا یہ سب سے بڑا حصہ بالکل ایک گرفتار قفس ہو کر صرف نادو شیوں کیلئے وقف ہو کے رہ گیا۔

حکومت جو امن و عدل اور قیام توازن کی اصلی ذمہ دار ہے، آزادی تجارت و صنعت کے اصول کو تسلیم کر کے اب ان معاملات میں مداخلت کے حق سے بالکل دستکش ہو چکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو طبقہ اس آزادی تجارت کی تیغ سے نیم بسمل تھا اس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ صنعت و تجارت کی یہ آزادی اس کے حق میں سم قاتل ہے۔ بس یہ تخیل ہماری اس سرزمین پر اشتراکیت کا پہلا بیج ہے جو بویا گیا۔ اس

اشتراکیت نے سب سے پہلے وقت کی اقتصادیات کے اس آزادی صنعت و تجارت والے اصول کی دھجیاں اڑائیں۔ اور اصل کے انحطاط، نظام کی خرابی اور اقتصادی و اجتماعی پراگندگی کی تمام ذمہ داریاں اسی اصول کے سر تھوپ دیں۔ پھر اس کے بعد اس نے تنقید کا دوسرا قدم اٹھایا اور نفس اس نظام سرمایہ داری پر تنقید شروع کر دی جو تمام نفع اٹھا کر چند آدمیوں کے ہاتھ میں دیدیتا ہے اور کاریگروں اور مزدوروں کو فقر و فاقہ میں سسکنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے۔

اشتراکیت کے تخیل کا ابتدائی نقطہ یہ ہے۔ لیکن ہم کو اس کے اندر کی حقیقت اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھ لینی چاہئے۔

اشتراکیت کا بنیادی تخیل یہ ہے کہ فرد کو جماعت کے مفاد کے لئے قربان کر دیا جائے۔ اس پہلو سے یہ "انفرادیت" اور اقتصادی آزادی کے تخیل سے ٹکراتی ہے۔ "انفرادیت" فرد کے شرف اور اس کی شخصیت کے قیام و حفاظت کی علمبردار ہے۔ اور یہ چیز صحیح طور پر اسی وقت تک محفوظ رہ سکتی ہے جبتک اقتصادی آزادی جو نظام اجتماعی کی اساس اور انفرادی جد و جہد کا اصلی سرچشمہ ہے قائم رہ سکے۔ "انفرادیت" حکومت کو اس زحمت میں مبتلا نہیں کرتی کہ وہ افراد کی خوش بختی و بدبختی کی کلی طور پر ذمہ دار ہو جائے، بلکہ یہ چاہتی ہے کہ حکومت ایسی ضمانتیں مہیا کر دے کہ افراد اپنے دائرہ کے اندر زیادہ سے زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے کاموں میں مشغول رہ سکیں۔ یہ چاہنے کی علت محض یہ نہیں ہے کہ وہ فرد کی آزادی اور اس کے مفاد کو خود غرضانہ زیادہ سے زیادہ محفوظ دیکھنے کی خواہش مند ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ اس کے نزدیک ہیئت اجتماعیہ کی تمام کامیابی درحقیقت افراد کی کامیابی پر منحصر ہے۔ پس اس بنا پر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہیئت اجتماعیہ کو ترجیح دیکر افراد کو اس کی قربان گاہ پر نذر چڑھا دیا جائے۔ بلکہ انصاف یہ ہے کہ ایک ...... اعتدال کے ساتھ دونوں کو شہ دینے اور بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ ایک کی ترقی دوسرے کی ترقی اور ایک کی بربادی دوسرے کی بربادی ہے۔

اشتراکیت یا اجتماعیت (ان دونوں میں سے جو نام بھی موزوں سمجھا جائے) حکومت یا بادشاہ کی امداد و حمایت پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتی۔ یہ اپنی حفاظت اور اپنی طاقت دونوں ایک زبردست اجتماعی تغیر کے ذریعہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس اجتماعی تغیر کے بہت سے طبعی، اقتصادی اور نفسیاتی عناصر ہیں، جن پر بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ شاید ہم آگے اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔ یہاں اشتراکیت کا نقطۂ نظر سمجھنے کے لئے بالاجمال انکا یہ خیال سامنے رکھنا چاہئے کہ وہ کہتے ہیں کہ سوسائٹی کا ہر نظام لازماً بدلتا رہتا ہے اور اس تبدیلی کا بہت کچھ تعلق سوسائٹی کی عقلی جد و جہد اور اجتماعی علوم کی ترقی اور ان کی عملی تطبیق سے ہے۔ پس جس رفتار سے یہ علوم ترقی کرتے جائیں گے اور زندگی عملاً ان کے سانچے میں ڈھلتی جائے گی اسی رفتار سے زندگی کے تمام وضعی قوانین اور ان کے تمام معروف ضوابط بدلتے جائیں گے یہاں تک کہ عقل اجتماعی ترقی کے آخری زینہ پر قدم رکھے گی۔ اور اس وقت زندگی کے مختلف نظاموں میں سے صرف وہ نظام باقی رہ سکے گا جو "انسب" ... ([illegible]) ہوگا۔ اور ظاہر ہے کہ وہ انسب نظام یہ موجودہ نظام نہیں ہو سکتا جس نے دنیا کے بہت بڑے حصہ کو صرف مٹھی بھر سرمایہ داروں کا غلام بنا رکھا ہے۔ یہ نظام بالکل فاسد ہے۔ زندگی کی فطری وضع اس کو ہرگز قبول نہیں کر سکتی۔ ضروری ہے کہ یہ بدل جائے کیونکہ یہ حق اور مساوات کے بالکل منافی ہے۔

ان باتوں میں سے چاہے سب سے ہم متفق نہیں ہو سکیں۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان میں بہت سی دنیا کی نہایت قدیم ترین سچائیاں ہیں، پس ان کے متعلق ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اشتراکیت کی پیداوار ہیں اور اگر یہ اشتراکیت کی پیداوار ہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اشتراکیت فکر انسانی کے ایک نظریہ کی حیثیت سے قدیم ترین زمانوں سے موجود ہے۔

اشتراکیت کی باطنی حقیقت سمجھ لینے کے بعد ہم کو ایک سرسری نظر اس کے مختلف ادوار، اس کے

تدریجی ارتقاء اور اس کے مختلف مذاہب (SCHOOLS) پر بھی ڈالنی چاہئے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں، اشتراکیت کے ابتدائی علمبردار، سین، سیمون اور روبرٹ اوین تھے۔ سیمن کے کچھ پیرو بھی تھے لیکن یہ سب خیالی قسم کے لوگ تھے ان کی تعلیمات کسی علمی بنیاد پر قائم نہ تھیں۔ بلکہ ان پر ایک قسم کا صوفیانہ اور فلسفیانہ رنگ غالب تھا۔ سیمن کا خیال یہ تھا کہ انسانیت کی خوش بختی اور ترقی کے لئے ضروری ہے کہ قدرتی ذرائع دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ طور پر عمل میں آئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ حکومت کے شعبوں کی نگرانی، فلاسفہ، علماء اور مزدوروں کے ہاتھ میں ہو۔

روبرٹ اوین کی اشتراکیت سیمن کی اشتراکیت سے کسی قدر تیز تھی۔ اس نے سرمایہ داری کے نظام کو بالکل ختم کر دینے کی تجویز پیش کی اور صنعت، تجارت، زراعت کے لئے ایک نیا نظام پیش کیا جس کی بنیاد زیادہ تر تعاون پر تھی۔

یہاں اس حقیقت کو ظاہر کر دینا بھی موزوں ہوگا کہ یہ رائیں زیادہ تر شیخ چلی کے منصوبوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی پشت پر عملی اصولوں کی کوئی طاقت نہ تھی۔ البتہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں کارل مارکس[۵۱] نے

---

[۵۱] کارل مارکس ۱۸۱۸ء میں پروشیا کے علاقہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ پہلے یہودی تھا پھر اس نے مسیحی مذہب اختیار کر لیا۔ کارل مارکس نے بان اور برلن کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور تاریخ، فلسفہ اور معاشیات میں کمال حاصل کیا۔ ۱۸۴۲ء میں اس نے یونیورسٹی کی تعلیم ختم کی۔ اس کے بعد سب سے پہلے اس نے ایک ریڈیکل اخبار کی اڈیٹری شروع کی، لیکن پروشیا کی گورنمنٹ اس کے آزادانہ اور انقلابی خیالات برداشت نہ کر سکی اور بالآخر اس نے اخبار بند کر دیا۔ اس کے بعد کارل مارکس پیرس چلا گیا۔ یہاں اس کی ملاقات مشہور جرمن اشتراکی فریڈرک اینگلس سے ہوئی اور اتحاد خیال نے ان دونوں میں ایک پائدار رشتۂ محبت قائم کر دیا۔

اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے کارل مارکس ۱۸۴۵ء میں پیرس سے بھی نکالا گیا لیکن اس وقت جبکہ وہ فرانس کے تمام اشتراکیوں کے خیالات اچھی طرح چوس چکا تھا۔ اب وہ برسلز گیا۔ فریڈرک اینگلس نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ یہاں پہنچکر جنوری ۱۸۴۸ء میں ان دونوں نے ملک مزدوروں کے نام اپنا مشہور اعلان شائع کیا جس میں ان کو دعوت دی کر "تمام دنیا کے مزدورو متحد ہو جاؤ"۔ اس آواز کی گونج کانوں میں باقی رہی یہاں تک کہ ۱۸۶۷ء میں مارکس نے اپنی مشہور کتاب "کیپٹل" شائع کی جس نے تمام دنیا کو اس کی طرف متوجہ کر دیا (ناصر)

انہی چند بے حقیقت قطروں کو جمع کر کے ایک سمندر بنا دیا اور پھر اس میں وہ طوفان اٹھا کہ تمام دنیا کا نظام اس سے لرزہ براندام ہے۔

مارکس کی اشتراکیت کے بعض بنیادی اصولوں کی طرف اشارہ کرنے سے پہلے ہم چاہتے ہیں کہ اشتراکیت کے مختلف مذاہب کی طرف بھی اجمالی اشارے کر دیں تاکہ آئندہ مباحث میں یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ یہ اپنے مختلف بھیسوں میں کس قدر مشترک کی حامل ہے۔

اشتراکیت کے مختلف مذاہب یا اسکول یہ ہیں:۔ شیوعیت (بالشوزم) فوضویت (انارکزم) جماعیت۔ مارکسیت، جدید مارکسیت۔

شیوعیت میں زیادہ تر اوہام و خیالات کا غلبہ ہے۔ اس کی دعوت کا زمانہ سولھویں اور سترہویں صدی ہے۔ ٹوماس مور نے اپنے ایک افسانہ میں ایک ایسے جزیرہ کا تصور آراستہ کیا ہے، جس میں ایک اونی و اخلاقی حکومت قائم ہے لوگ خوش خوش زندگی بسر کر رہے ہیں لیکن افراد کو خود مختارانہ تصرف کی اجازت حاصل نہیں ہے۔ ان کو اپنے تمام اعمال و تصرفات میں جماعت کے احکام کی پیروی کرنی پڑتی ہے جو در حقیقت تمام قانونی اختیار کی مالک ہے۔

بس ٹوماس مور کے اس تصور کو شیوعیت کا تصور سمجھنا چاہئے۔ قدیم حکماء میں سے افلاطون کی جمہوریت میں کچھ اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شیوعیت کے لئے دو باتیں ضروری سمجھی جاتی ہیں۔

۱۔ اس کے لئے دائرہ عمل نہایت مختصر ہو۔ دائرہ عمل جتنا مختصر ہوگا اتنا ہی اس کا قیام آسان ہوگا۔

۲۔ جو جماعت اس نظام کو اختیار کرے اس کے لئے پوری طرح طاقتور ہو کر تقسیم دولت کی پوری پوری نگرانی کر سکے تاکہ کوئی فرد اپنے حصہ سے زیادہ نہ لے۔

فوضویت (انارکزم) یہ ذرا شیوعیت سے تیز قسم ہے۔ اس میں فرد کی آزادی، حکومت سے نفرت انفرادی ملکیت اور مزدوری سسٹم کی مخالفت سب چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ اس اسکول کا بانی پرودھن (Proudhon)

ہے جس کا مقولہ مشہور ہے کہ "ملکیت عین سرقہ ہے"۔

یہ سیاسی اور اجتماعی فوضویت ہے۔ ذہنی اور دماغی فوضویت اس سے الگ ہے، اس کا تعلق افراد و جماعات سے ہے۔ اس کا مصدر انسان کی "انانیت" اور حب نفس ہے۔ ایم اسٹرز ([illegible]) اس کے اولین داعیوں میں سے ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ فکر و رائے کی آزادی سے متمتع ہو سکے۔ وہ جو چاہے سوچے، جو جی میں آئے عقیدہ رکھے، جو بات زبان پر آئے بلا خوف ظاہر کر سکے۔ نہ تو اس کے دل پر کوئی پہرہ ہو نہ زبان پر کوئی احتساب۔ فرد کے مصالح کی راہ کے تمام پتھر ہٹا دیئے جائیں۔ جو نہ ہٹ سکیں وہ رائے عامہ کی بھاری گرز سے ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں۔

سیاسی و اجتماعی فوضویت کا مطالبہ یہ تھا کہ فرد کو مطلق العنان آزادی حاصل ہو۔ اس باب میں اسکو کسی اطاعت کے لئے سرنگوں نہ ہونا پڑے کیونکہ ہر اطاعت کا لازمی نتیجہ انسان کے لئے کسی نہ کسی حق سے دستبرداری ہے۔ اس مذہب کی اصلی حقیقت مختصر لفظوں میں اگر بیان کی جائے تو یہ ہے کہ "سوسائٹی کو فرد پر ان قیود کے علاوہ کوئی قید عاید کرنے کا اختیار نہیں جو فطرت نے عاید کر دی ہیں"۔ پرودھن کے بعد اس مذہب کے مشہور علمبردار باکونین وغیرہ ہوئے۔

جماعیت (Collectivisme) کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ تمام وسائل دولت یعنی زمین معادن، کارخانے، بینک وغیرہ جماعت کی ملکیت ہوں۔ رہا دولت کے صرف کرنے کا معاملہ تو یہ ان لوگوں کا حق ہے جو اپنی عرق ریزی اور جانفشانی سے اس کو پیدا کریں۔ گویا شیوعیت اور جماعیت میں یہ فرق ہے کہ شیوعیت ملکیت کا علی الاطلاق انکار کرتی ہے لیکن جماعیت اس کو بالکلیہ باطل نہیں کرتی۔ بلکہ پیداوار اور وسائل پیداوار میں فرق کرتی ہے۔ پیداوار کو پیدا کرنیوالوں کی ملکیت قرار دیتی ہے اور وسائل دولت کو جماعت کی نگرانی میں رکھنا چاہتی ہے۔ یہی جماعت ہر فرد کے کام اور اس کی ذمہ داری کی تعین کرتی ہے اور پیداوار کے حصول کے لئے اس کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، مہیا کرتی ہے۔ لیکن یہ بات

یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ پیدا کرنے والے کو اپنی پیداوار بیچنے کا حق نہیں ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنی محنت کا حاصل جماعت کے سپرد کر دے۔ جماعت اس کی محنت و کوشش اور پیداوار کے اعتبار سے اس کو قیمت دیگی۔ یہ صنعتی جماعیت ہوئی۔ زراعتی جماعیت اس سے الگ ہے۔ اسکا قانون یہ ہے کہ زمین سب کی ملکیت ہو۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اشتراکی خیالات کے یہ منتشر ذرات ہیں جو افلاطون کے زمانہ سے لیکر ٹوماس مور اور واٹز وغیرہ کے زمانوں تک فضا میں پراگندہ رہے لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں کارل مارکس پیدا ہوا جس نے ان سب کی جمع و تکمیل اور ترکیب و تحلیل سے ایک "علمی اشتراکیت" یا "مارکسیت" کا نظام آراستہ کیا اور اس نے دیکھتے دیکھتے تخیل کے زاویہ سے نکلکر دفعۃً عمل کی دنیا میں قدم رکھدیا اور اب اس کے پیدا کئے ہوئے خطروں اور اندیشوں سے ایک عالم کی نیند حرام ہے۔

ذیل میں ہم کارل مارکس کے بعض بنیادی نظریات پیش کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ اب اسی کے نظریات موجودہ اشتراکیت کی بنیاد ہیں اس لئے ہم تنقید میں بھی انہی نظریات کو اصل قرار دیں گے۔

اجتماعی حرکت کے باب میں کارل مارکس کا نظریہ یہ ہے کہ اصلاً افراد کو جو چیز حرکت میں لاتی ہے وہ مادی مصالح ہیں اور پھر یہیں سے ان کا اثر تمام اخلاق اور سسٹم پر محیط ہو جاتا ہے - وہ اس نظریہ کا بالکل مخالف ہے کہ اصلی محرک افکار و اخلاق ہیں۔

اپنے اس نظریہ کی روشنی میں وہ دیکھتا ہے کہ ہمیشہ سے ایک ہی جماعت کے مختلف طبقات کے اندر ایک مستقل تنازع اور کشمکش برپا رہی ہے۔ اور انقلابات و تغیرات نے کبھی ایک طبقہ کو اچھالا کبھی دوسرے طبقہ کو۔ اب ایک عظیم انقلابی تغیر موجودہ جماعت کو ایک اجتماعی نظام کی طرف کھینچ کر لیجا رہا ہے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے۔

قرون وسطیٰ میں تھوڑے سے امراء و اشراف طبقۂ متوسطہ کو چوستے تھے اور طبقۂ متوسط نظام جاگیرداری سے
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

نبرد آزما تھا بالآخر جب طبقۂ متوسط کے لوگ اپنے حقوق میں کامیاب ہوکر سرمایہ داروں کے ایک مخصوص طبقہ میں بدل گئے تو انھوں نے مزدوروں کا خون چوسنا شروع کیا۔ اب یہ طبقہ مزدوروں کو ان کی واجب مزدوری تک نہیں دیتا اور اس طرح ان کے عمل کے ایک حصہ کو بھی دبا بیٹھتا ہے۔ مارکس کے نزدیک عادلانہ اور واجب اجرت یہ ہے کہ وہ مزدور کی محنت کے اعتبار سے ہو اور سرمایہ دار کا حال یہ ہے کہ وہ مزدور کے عمل کے ایک حصہ کو بھی ہڑپ کرکے اپنی پیداوار میں اضافہ کرتا جاتا ہے۔ اس طرح مارکس کے نزدیک پیداوار کا ایک حصہ صرف سے بچ رہتا ہے اور یہی حصہ ہے جو بالآخر پیداوار اور صرف کے توازن کو گڑبڑ کرتا ہے اور قلت صرف کی اقتصادی مشکلات پیدا ہوتی ہیں کیونکہ مزدور کو جتنا صرف کرنا چاہئے وہ مزدوری کی قلت کی وجہ سے اتنا صرف کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس طرح ہم علانیہ دیکھ رہے ہیں کہ اغنیا کا طبقہ جو صاحب مال ہے مزدوروں کے غریب طبقہ کے کندھوں پر لدا ہوا ہے۔ یہیں سے غریب اور دولتمند یا مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ شروع ہوگئی۔

مارکس اس کشاکش کو اس طرح ختم کرنا چاہتا ہے۔

(۱) تمام وسائل دولت جماعت کے تصرف میں ہوں، افراد کے ہاتھوں میں صرف وہ حصہ ہو جو صرف کیلئے ہو۔

(۲) پیداوار کی تنظیم کی جائے اور بواسطہ جماعت پیداوار اور صرف کو متوازن رکھا جائے۔

(۳) عمل کو صرف اساس قیمت یا سبب قیمت نہ قرار دیا جائے بلکہ اس کو جوہر قیمت اور مادہ قیمت قرار دیا جائے۔ یعنی کسی شئی کی قیمت کی تعیین اس کی منفعت کے اعتبار سے نہ ہو، اس اعتبار سے ہو کہ اس کے بنانے میں کتنا وقت صرف ہوا ہے۔

مارکس اپنے نظریات کی عملی تکمیل ایک عظیم اقتصادی انقلاب کے ذریعہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا عظیم انقلاب جو تمام وسائل دولت جماعت کے ہاتھوں میں دیدے یہاں تک کہ عمال جو کچھ بھی پیدا کریں وہ ان کی ملکیت ہوجائے اور اس طرح طبقۂ مغلوبہ طبقۂ غالبہ کے دباؤ سے بالکل آزاد ہوجائے۔

کارل مارکس کی نظری زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں کارنامہ ایک اور ہے جس کا ذکر اس کے باطن کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے۔ اس نے تاریخ کی تفسیر بھی بالکل اقتصادی نقطۂ نظر سے کردی ہے۔ اسکا خیال ہے کہ پیداوار کے وسائل اور قوتیں ہی سوسائٹی کیلئے خود نظام پیدا کرتے ہیں پس یہ صحیح نہیں ہے کہ سوسائٹی کی اصلاح کیلئے ان مثالی نظریات کو سامنے رکھا جائے جو بلند و بالا عالم مثل کے خیالی مصنفین نے تراشے ہیں۔ سوسائٹی کی تشکیل و ترکیب ان اساسی تاروں سے بنی ہوئی ہے۔ مارکس کے نظریہ کے لحاظ سے تمام مادی واخلاقی فروق زراعتی و صناعتی ماحول سے وجود میں آتے ہیں۔ پیداوار اور صرف کے طریقے سے تقسیم دولت کا طریقہ پیدا ہوتا ہے۔ اور پھر یہی جماعت کیلئے اقتصادی، سیاسی اور ادبی نظام کا ڈھانچہ تیار کرتا ہے۔ اس نظریہ کی مزید توضیح وہ یوں کرتا ہے کہ پہلے امراء و اشراف اپنے مصالح کیلئے زمینوں اور جائدادوں پر قابض تھے۔ پھر جاگیرداری کا زمانہ ختم ہوا اور طبقۂ متوسط (Bourgeois Capitalist) نے ان کی جگہ لی۔ اور یہی سرمایہ داروں کا طبقہ ہے جو اپنے بڑے بڑے منافع کے لئے تمام دولت اور تمام مزدوروں کو جذب کئے ہوئے ہے۔ لیکن جب ان کی جگہ زمین اور جائدادوں کے مالک مزدور ہوجائیں گے تو یہ طبقہ آپ سے آپ ختم ہوجائیگا۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ زراعتی ماحول نے امراء کو زمین پر قبضہ دلایا، پھر آلات اور صنعت کا دور آیا اور طبقۂ متوسط کو موقع ملا کہ وہ دولت اور مزدوروں کی قسمت کا مالک ہو۔ اب جبکہ اشتراکیت نمودار ہوجائیگی تو دنیا میں مزدوروں کی حکومت قائم ہوجائیگی اور اس طرح سرمایہ داروں کا طبقہ ختم ہوجائے گا۔

اگرچہ کارل مارکس نے اشتراکیت کو اس دنیا کا ایک قدرتی دور قرار دیا ہے اور اس کے خیال میں اس دور کا آنا اسی طرح قطعی اور ناگزیر ہے جس طرح ایک انسان پر جوانی کے بعد بڑھاپے کا آنا، لیکن اب تک یہ دور آیا نہیں اور مزدوروں کی دل بادل فوج سرمایہ داروں کی مٹھی بھر جماعت کو شکست دینے سے ہنوز عاجز ہے۔

اشتراکیت کے مختلف ادوار، اس کے مختلف مذاہب اور پھر اس کے موجودہ نظریات کا ایک اجمالی خاکہ پیش کردینے کے بعد اب ہم چاہتے ہیں کہ اس پر ایک اور سرسری نظر ڈالیں اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے؟ ۔ آیا یہ سچ مچ دنیا کی نجات کا پیغام ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے یا اس کی بے شمار مشکلوں میں ایک نئی لاینحل مشکل کا اضافہ جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے۔

(باقی)

حکمتِ غرب

مارکس اریلیس کے خیالات

۸

از جناب مولوی نیاز احمد صاحب صدیقی ایم اے

بغیر کسی مقصد کے گمراہ مت ہو، اس بات کا خیال رکھ کہ ہر تحریکِ طبعی میں انصاف کو کہاں تک دخل ہے، تاثرات پر اپنے عقل کا قابو قائم رکھ

کائناتِ عالم! وہ سب کچھ جو تیرے لئے خیر ہے وہ میرے لئے بھی خیر ہے، جو حالات بھی تجھ میں مناسب و موزوں وقت پر رونما ہوتے ہیں وہ میرے لئے قبل از وقت یا بعد یہ نہیں رونما ہوتے۔ فطرت! تری موسموں کی ارزانی میرے لئے خالصاً ثمربار ہوتی ہیں، تمام چیزوں کی منبع و مرجع تو ہی ہے، ترے ہی دامن میں ان کو دوام حاصل ہے۔ شاعر! تو دیار سراپ کو محبوب (وطن) کہہ کر اس کا ترانہ گاتا ہے، کیا تو یہ نہیں کہہ سکتا، دیار الٰہی! دیار محبت!!

"تھوڑا کرو اور خوش رہو، یہ درویش کا مقولہ ہے، لیکن کیا صرف ضروری ہی باتوں کا کرنا بہتر نہیں ہے قطع نظر اس سے کہ بحیثیت زندہ مخلوق کے ہماری زندگی کے قوانین کیا اور کیسے ہیں اور ایک جماعت کے افراد فطرتاً کون اور کیسے قوانین وضع کرتے ہیں۔ ایسا ارادہ کرنے سے نہ صرف کام کی

بوجوہ احسن انجام دہی باعثِ مسرت ہوتی ہے بلکہ وہ مسرت تھوڑا کام کرنے ہی سے حاصل ہو جاتی ہے۔ ہمارے قول و عمل اکثر و بیشتر قطعی غیر ضروری ہوتے ہیں۔ ان سے احتراز بڑی مشقتوں اور زحمتوں سے نجات کا باعث ہوگا۔ پس ہر موقع پر ہم کو خود اپنے سے یہ سوال کرنا چاہئے "آیا بیکار باتوں میں سے یہ ایک بیکار بات ہے" لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم کو یہ بات ہمہ وقت یاد رکھنی چاہئے کہ صرف بیکار باتوں ہی کو عملی زندگی سے حذف کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اسی حد تک ہم کو اپنے خیالات کو آلودگیوں سے بھی پاک کرنا چاہئے کیونکہ صرف اسی طور پر یہ بات ممکن ہے کہ ہم اپنے سلسلۂ خیالات کو بے مقصد فعل میں منتقل ہونے دیں۔

کیا تو نے ان تمام باتوں کی طرف توجہ کی ہے؟ اچھا، اب اس طرف توجہ کر، مضطرب مت ہو، سادگی اختیار کر، کیا انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے؟ وہ خود اپنا ہی گنہگار ہوتا ہے۔ کیا تجھ پر کوئی افتاد پڑی ہے؟ اگر ایسا ہے تو بہتر ہے۔ جو کچھ تجھ پر گذرتی ہے وہ ازل سے تیرے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ وہ نوشتۂ تقدیر تھی۔ زندگی مختصر ہے۔ انصاف اور عقل کے مطابق زمانہ حال سے مستفید ہو، خوشحالی میں اعتدال پر قائم رہ۔

کائناتِ عالم یا تو ایک منظم و پرسکون کل ہے یا پرآشوب ہے۔ ممکن ہے اس میں انتشار و اضطراب ہی کا غلبہ ہو لیکن بہرصورت یہ ایک کل ہے۔ کیا تیرا خیال ہے کہ تیرے اندر کی چھوٹی دنیا میں امن و سکون کا تسلط ہو اور باہر کی بڑی دنیا میں سراسر انتشار و بدامنی۔ اور یہ سب کچھ ایسی صورت میں جبکہ ساری چیزیں جو کجا یا منتشر ہوں، ایک مشترک ہمدردی میں متحد ہیں

سیرت، ناپاک، بزدلانہ، ضدی، بیمایہ، طفلانہ، وحشیانہ، احمقانہ، مبتذل، کمینہ اور ظالمانہ ہو سکتی ہے۔

اگر وہ شخص اجنبی ہے جس کو معلوم نہیں کہ دنیا میں ہے کیا تو دوسرا شخص جس کو معلوم نہیں کہ دنیا میں ہوتا کیا ہے تو وہ اول الذکر سے کم اجنبی نہیں ہے۔ وہ شخص جو جماعت کے قانون سے بھاگتا ہے بے وفا غدار ہے۔ وہ جس کے دل کی آنکھیں سوتی ہیں دراصل اندھا ہے۔ وہ جو ضروریات زندگی کا خود حامل نہیں اور دوسروں کی امداد کا متمنی ہوتا ہے دراصل محتاج فقیر ہے۔ وہ جو عالمگیر فطرت کے قوانین سے اس وجہ سے قطع تعلق اور علٰحدگی اختیار کرتا ہے کہ اس کو معمولات فطرت بھاتے نہیں، وہ کائنات فطرت میں دراصل ایک شے ناجنس ہے کیونکہ منجملہ دوسری چیزوں کے تجھے بھی وہی فطرت عالم وجود میں لائی ہے۔ وہ شخص جو اپنے روحانی تعلقات کو عقلی زندگی کی واحد عالمگیر روح سے بالکل منقطع کر لیتا ہے وہ بمنزلہ ایک ٹوٹے ہوئے جیر کے ٹکڑے کے ہے جو حکومت کی بھاری چٹان سے ٹوٹ کر الگ ہو گیا ہے۔

ممکن ہے ایک شخص کے پاس کوئی لبادہ نہ ہو اور دوسرے کے پاس ایک کتاب بھی نہ ہو باایں ہمہ دونوں فلاسفر ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ تیسرا شخص بھی ہے جو نیم برہنہ ہے، باوجود اس کے وہ کہتا ہے اگرچہ میں روٹیوں کا محتاج ہوں پھر بھی عقل کا مکمل حامل ہوں۔

تم کو اس فن سے شغف ہونا چاہئے جس کو تمہیں سیکھنا ہے اور اس پر قناعت کرو۔ زندگی کے ذریعہ زیارت سے اس زاہد کی طرح عہدہ برا ہو جس نے بہ دل و جان اپنی ساری متاع خدا کے سپرد کر دی ہے اور جو بنی نوع انسان پر کبھی ظلم نہیں کرے گا اور نہ کبھی غلامی قبول کرے گا۔

ویسپاسین (Vespasiann) کے دور کو یاد کرو۔ اس زمانہ میں بھی وہی قدیم باتیں نظر آتی ہیں یعنی شادی، سلسلہ توالد و تناسل، بیماری، موت، جنگ، معاندانہ چشمک، تجارت

زراعت، ذلیل خوشامد، ضد۔ ایک شخص کسی کی موت کے لئے دعائیں کرتا ہے اور دوسرا اپنی قسمت کا گلہ۔ تیسرا عشق و محبت یا حصول دولت میں مبتلا ہے۔ کچھ اور لوگ ہیں جو صوبہ داری یا حکومت کی ہوس میں سرشار رہیں۔ ان لوگوں نے اپنی اپنی زندگی پوری کی اور اب خود اپنے ہی ملک میں گم نام ہیں۔ ٹراجن کے دور کو لو۔ وہی قصہ یہاں بھی ہے۔ آج انکا بھی کچھ پتہ نہیں۔ پس دوسرے اہم زمانوں اور مشہور قوموں کی تاریخ پر غور کرو۔ تم کو معلوم ہوگا کہ عظیم الشان جدوجہد کے بعد کتنی قوموں کا زوال ہوا اور وہ سب پھر اپنے عناصر میں تحلیل ہو گئیں۔ خصوصیت کے ساتھ ان اشخاص کو یاد کرو جن کو تم نے بچشم خود دیکھا ہے کہ وہ کس طرح سے مہمل مضمون میں استعمال کی گئی ہیں...... اور ادھر ادھر کٹ پتلی کی طرح متحرک رکھی گئیں۔ یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ ان گروہوں نے وہ نہ کیا جس کے لئے وہ پیدا کئے گئے تھے انھوں نے فریضہ کی انجام دہی اور سکون قلب کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے انکار کیا۔ یہاں اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر چیز توجہ کی متقضی اسی حد تک ہوتی ہے جہاں تک قدر و قیمت اور تناسب کا قانون اس کو توجہ کا مستحق بناتا ہے۔ ایسا اصول اختیار کرنے سے تجھکو ضمیر کی کوئی خلش نہ محسوس ہوگی۔ اگر تو چیزوں کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دے گا جتنی کہ وہ مستحق ہیں۔

جو الفاظ روزانہ کی گفتگو میں گذشتہ نسلیں استعمال کرتی تھیں آج وہ شرح و وضاحت کے محتاج ہیں۔ یہی حال زمانہ قدیم کے مشہور ناموں کا ہے Voleous - Caeso - Camillus Leonnatus. کے نام آج کانوں کو بالکل نامانوس معلوم ہوتے ہیں Scipsis اور Cato سے بھی لوگ جلد ناآشنا ہو جائیں گے Antonimus اور Handriaw کا بھی بہت جلد یہی حشر ہوگا۔ انسانی شان و شکوہ کتنی جلد صرف ایک داستان ہو کر رہ جاتا ہے اور اسکو لوگ کتنی جلد بالکل ہی فراموش کر دیتے ہیں۔ میں نے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ ایسے لوگوں کی ہیں جن کو حالات نے شغلہ مستقبل

کی طرح چمکایا اور بجھایا۔ ان کے علاوہ دوسری بہتیری ہستیاں ایسی ہیں کہ ان کی روح نے جونہی قید جسم سے آزادی حاصل کی وہ محروم احترام و ستائش ہوکر ناپید ہوگئیں۔ پھر اس ابدی شہرت کی حقیقت کیا ہے؟ صرف نمود و نمائش۔ سب سے بڑی نمود و نمائش!! پھر وہ کیا چیز باقی رہ جاتی ہے جس کے حصول میں انسان کو ہمہ تن کوشاں ہونا چاہئے۔ وہ چیز صرف ایسا دماغ ہے جس کو عدل گستری کے لئے سنوارا گیا ہو۔ وہ صرف ایسا عمل ہے جس کا مقصد جماعت کی بہبود ہو۔ وہ صرف ایک زبان ہے جو کذب سے ناآشنا ہے، وہ صرف ایک ایسی طبیعت یا مزاج ہے جو قسمت کی ہر گردش کا استقبال بخیر مقدم کرتا ہے گویا وہ ضروری بھی تھی اور اس کو پہلے سے اس کا علم بھی تھا اور اس کا منبع و سرچشمہ وہی سبب اولین ہے۔

(باقی)

ایک عمدہ عربی ریڈر

امثال آصف الحکیم

از استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

ہم لوگوں کو عربی کے ابتدائی درجوں میں پڑھانے کیلئے عرصے سے ایک عمدہ ریڈر کی تلاش تھی۔ مگر کوئی مناسب ریڈر نہ ملی۔ مصر کے مدارس میں جو ریڈریں پڑھائی جاتی ہیں وہ منگوئیں مگر یہاں کے نصاب سے انکا میل نہ ہوا۔ اتفاق سے مولانا کے کاغذات میں دیکھا گیا تو ایک نہایت عمدہ عربی ریڈر مل گئی جو انھوں نے نصاب تعلیم کے لئے تیار کی تھی۔ یہ ریڈر دائرہ نے چھاپکر شائع کر دی ہے۔ عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کیلئے بہترین چیز ہے۔ اساتذہ و منتظمین دیکھکر اس کو پسند کریں گے۔ مدرسۃ الاصلاح نے اپنے نصاب کے لئے اس کو پسند کر لیا ہے۔ کتابت و طباعت بہترین کاغذ عمدہ قیمت ۸/ آٹھ آنے۔

منیجر

تلخیصات

تمدن کی اپج!

یورپ اور امریکہ کے عجیب و غریب مدارس

جن ممالک میں تعلیم کو اہمیت حاصل ہے وہاں عام سرکاری مدارس کے علاوہ پرائیوٹ مدارس بھی ہوتے ہیں جو ایسے مقاصد کے لئے قائم ہوتے ہیں جو سرکاری مدارس سے پورے نہیں ہوسکتے اور چونکہ ان کا تعلق خاص خاص اشخاص اور خاص جماعتوں سے ہوتا ہے اس لئے ان میں اتنی ندرت ہوتی ہے کہ غلام ملکوں کے لوگ ان کے حالات پڑھکر صرف حیرت کا اظہار کرسکتے ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے وہ مدارس جو وہاں کے مقبول عام نظریات کی ترجمانی کرتے ہیں ان کے حالات بھی ہمارے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہوتے پھر ان مدارس کی طرفگی اور ندرت کا کیا کہنا ہے جو قائم ہی اس لئے ہوتے ہیں کہ طبیعت کی اپج اور دکھاوا پسندی کا مظاہرہ کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ قابل ذکر درسگاہ، امریکہ کی ریاست ورجینیا میں ہیمپٹن اسکول ہے۔ اس کو ایک کامل اجتماعی وحدت کے بہترین نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کے تمام طلبہ حبشی ہیں۔ لیکن اساتذہ کی جماعت سفید و سیاہ دونوں قوموں کے افراد پر مشتمل ہے۔ درسگاہ کی اپنی زمین ۱۱۵۰ ایکڑ ہے اور مکانات کی تعداد ۱۵۰ ہے۔ ابتدا میں صرف ایک معمولی سی عمارت بنوائی

گئی تھی۔ بعد میں حسب ضرورت مکانات بنتے گئے اور لطف یہ ہے کہ پہلی عمارت کے علاوہ بقیہ تمام عمارتیں خود طلبہ نے بنائی ہیں اور چونکہ اس درسگاہ کا اصلی مقصد ایک مستقل اور کامل اجتماعی وحدت کا مظاہرہ ہے اس لئے اس میں نہ کوئی معمار نظر آئے گا، نہ بڑھئی، نہ جولاہا نہ انجینیر، حجام نہ بیرا، کسان نہ کوئی باورچی، تمام کام طلبہ خود اپنے ہاتھوں انجام دیتے ہیں، اصحاب پیشہ اس دنیا میں عنقا ہیں۔ طلبہ کی کل تعداد تقریباً چار ہزار ہے جن میں نصف لڑکیاں ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں میں کام تقسیم کردیئے گئے ہیں۔ اول الذکر کے ذمہ کھیتی کرنا، مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا، درخت اور پھول لگانا، غلہ اکٹھا کرنا اور اسے صاف کرنا وغیرہ ہے اور ثانی الذکر کے فرائض میں، دودھ دوہنا اور اسے گرم کرنا، کھانا تیار کرنا، کپڑے دھونا، گھروں کی صفائی، سونے کے کمرے کو ٹھیک کرنا اور دار الطعام (ڈائننگ ہال) میں کام کرنا وغیرہ داخل ہے۔ کچھ موسیقی سے محظوظ کرتی ہیں۔ بعض کے ذمے کپڑوں کی قطع و برید ہوتی ہے، کچھ موٹروں کی صفائی اور اس کی مرمت کرتی ہیں۔ غرض یہ درسگاہ اپنی تمام ضروریات خود آپ پوری کرتی ہے، خارج سے بالکل بے نیاز ہے۔

یہاں "سلف سپورٹنگ" (اپنی مدد آپ کرنا) کے نظریہ پر عمل درآمد ہے جسکا وردھا تعلیمی سکیم کی شکل میں ہندوستان بھی تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ طلباء عام طور پر جنگی لباس پہنتے ہیں، بندوقیں رکھتے ہیں، گھوڑے کی سواری کرتے ہیں، تیر اندازی اور پیرنا سیکھتے ہیں۔ کلچر کے کام لڑکے اور لڑکیاں ساتھ ملکر کرتے ہیں لیکن صنعت، زراعت اور تجارت کے کام دونوں علحدہ علحدہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈائننگ ہال میں اجتماع ہوتا ہے اور اس وقت تک دونوں جدا نہیں ہوتے، جب تک سونے کا وقت نہیں آتا۔ طلباء کی اپنی انجمنیں بھی ہوتی ہیں، جہاں نظم و انتظام سکھلایا جاتا ہے۔ اور جدید سیاسی خیالات کے متعلق معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

اس درسگاہ کے نمونے پر امریکہ میں بہت سے اور مدرسے بھی قائم ہوئے۔ انگلستان کے بعض جدید مدارس

میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے وہاں اس قسم کا مشہور و ممتاز مدرسہ مشہور انگریز فلسفی برٹرانڈ رسل کا مدرسہ ہے۔ اس مدرسہ کے انتظام میں موصوف کی بیوی بھی برابر کا حصہ لیتی ہیں۔ یہ ۱۹۲۷ء میں قائم کیا گیا ہے۔ اس مدرسہ میں دو سال سے لیکر اٹھارہ سال تک کے لڑکے اور لڑکیاں داخل ہوسکتے ہیں۔ امریکہ کے مذکورہ مدرسہ سے اس مدرسہ میں ممتاز اور عجیب چیز یہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ایک ہی کمرہ میں سوتے ہیں۔ اس مدرسہ کو قائم ہوئے تقریباً دس سال ہوچکے ہیں، مگر اب تک کسی ناگوار واقعہ کی رپورٹ نہیں ہوئی ہے۔ انگلستان میں اس قسم کے اور بھی مدارس اسی فلاسفر کی نگرانی میں قائم ہوئے ہیں۔

پیرس سے قریب، ڈی روش (Des Roches) نام کا فرانس میں بھی ایک عجیب و غریب مدرسہ ہے۔ یہ خاندانی اصول (فیملی سسٹم) یا اجتماعی وحدت پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ کوئی نیا مدرسہ نہیں ہے۔ اس کی بنیاد، ڈی مولان کی مشہور کتاب "اینگلو سیکسن کی ترقی کا راز" کی اشاعت کے بعد ۱۸۹۹ء میں پڑی ہے۔ یہ کتاب مرحوم احمد فتحی زغلول پاشا کے قلم سے عربی میں بھی منتقل ہوچکی ہے۔

بظاہر تو یہ یونیورسٹی اپنے طلبہ کو فرانس کی تعلیمی ڈگری کے لئے تیار کرتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی صنعت، دستکاری، پیراکی، فنون جمیلہ اور غیر ملکی زبان کی طرف بھی وہ پوری توجہ مبذول کرتی ہے اسکی طرف سے طالب علم کو اس وقت تک ڈگری نہیں دیجاتی، جب تک وہ کسی غیر ملک میں کم از کم چھ مہینہ رہکر وہاں کی زبان میں دستگاہ نہ حاصل کرلے۔ مثلاً اگر کسی طالب علم نے انگریزی زبان کو اختیار کیا ہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ انگلستان کے کسی علمی خاندان کے ساتھ یا کسی استاذ کی رہنمائی میں کم از کم چھ مہینہ رہ کر زبان میں مہارت حاصل کرلے اور اس کے ساتھ یہ ضروری شرط ہے کہ اس مدت میں کوئی فرانسیسی طالب علم اس کے ساتھ نہ ہو تاکہ وہ صرف انگریزی ہی بولنے پر مجبور رہو۔ جرمن اور فرانسیسی زبانیں سیکھنے والے طلبہ بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

طلبہ کو جماعتی زندگی کا عادی بنایا جاتا ہے۔ ہر جماعت کے ساتھ ایک معلم یا معلمہ اور اس کے خاندان کے چند افراد بھی ہوتے ہیں اور اگر مخلوط تعلیم ہوئی، تو اساتذہ میں مرد اور عورتیں دونوں شامل ہوں گے اور سب مل کر ایک خاندان کے افراد کی طرح زندگی بسر کریں گے۔ اس درسگاہ کو در حقیقت امراء و نوابوں کی درسگاہ کہنا چاہئے کیونکہ ہر طالب علم کو سالانہ ۲۵۰ سے لیکر ۳۰۰ پونڈ تک ادا کرنے پڑتے ہیں۔

برسلز میں بھی مدرسہ دکرولی کے نام سے ایک مشہور مدرسہ ہے۔ اس کے بانی ڈاکٹر اوفید دکرولی ہیں۔ آج کل اسے (Ecol d' Hermilge) کہتے ہیں۔ اس مدرسہ کا نظام ہمارے معروف طریقوں سے بالکل مختلف ہے۔ اس کا کوئی مخصوص و متعین نصاب تعلیم نہیں ہے بلکہ طالب علم کی ذات کو ایک مرکز قرار دیکر تمام کائنات سے اس کا لگاؤ واضح کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ان کی تعلیم کے عنوان یہ ہوں گے "بچہ اور جماعت"، "بچہ اور دنیا"، "بچہ اور عالم نباتات" وغیرہ پھر انہی بڑی بڑی وحدتوں سے چھوٹی چھوٹی وحدتیں بنائی جاتی ہیں۔

اس مدرسہ کی کسی کلاس کو دیکھو تو تم کو کارخانہ کا گمان ہوگا۔ ہر طالب علم کو کچھ نہ کچھ کام کرنا پڑتا ہے۔ معلمہ یا معلم کو مزدوروں کی طرح سفید کابشٹن پہننا ہوتا ہے۔ طلبہ کو کھیل کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ چنانچہ اگر تم انھیں پارک میں دیکھو گے تو خیال ہوگا کہ وہ کھیل رہے ہیں، حالانکہ وہاں ان کی تعلیم ہو رہی ہوگی۔ حیوانات اور پرندوں کی دیکھ بھال میں پاؤ گے تو شبہ گذرے گا کہ وقت ضائع کرتے ہیں حالانکہ وہاں بھی وہ تعلیم ہی میں ہوتے ہیں۔ یہی حال ان کا درجوں میں ہوتا ہے۔ وہ ہر جگہ آزاد اور ایک وسیع فضا میں خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ وہ دیواروں پر رنگ برنگ کے کارٹون بناتے ہیں اور کاپیوں کے حاشیہ پر اخبارات و رسائل سے چھوٹی چھوٹی تصویریں کاٹ کر، اون روئی اور دوسری خام اشیاء کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چپکاتے ہیں، جنہیں دیکھکر یہ خیال ہوگا کہ

اس مدرسہ کے لڑکے اور اساتذہ محض فضول کام میں وقت ضائع کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں ہے۔

اس مدرسہ میں ہر معلم کے لئے لازمی ہے کہ وہ طباعت میں مہارت رکھتا ہو اور اسی طرح ہر طالب علم کے لئے بھی طباعت کا سیکھنا ضروری ہے۔ اس کی مشق وہ اپنے اور مدرسہ کے کاموں پر کرتے ہیں۔ گو طلبہ شاندار مکانات میں رہتے ہیں۔ لیکن درسگاہ میں ان کی حیثیت بالکل مزدور کی سی ہوتی ہے۔ یہاں مصارف بھی کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ ۱۳ سے ۱۸ پونڈ تک سالانہ خرچ ہوتا ہے۔

باوجودیکہ سرکاری مدارس سے اس کو دور کا بھی علاقہ نہیں ہے لیکن اس کے اعتبار اور معیار پر لوگوں کو پورا اعتماد ہے، حتیٰ کہ حکومت اور بلجیم کی یونیورسٹیوں کے نزدیک بھی اس کی سند اعلیٰ ڈگری کے مساوی سمجھی جاتی ہے۔ نیویارک کا مدرسہ لنکوین بھی اس سے بہت زیادہ مشابہ ہے۔ اس میں بھی کوئی نصاب تعلیم مقرر نہیں ہے۔ یہاں تعلیمی تجربے ہوتے ہیں۔ داخلہ کے وقت طلبہ کو یہ آگاہ کر دیا جاتا ہے کہ اس مدرسہ میں امریکہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے امتحانات میں کامیابی کی قطعی ذمہ داری نہ ہوگی، لیکن اس کے باوجود، طلبہ امتحانات میں شریک ہوتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں، حالانکہ پورا ۱ سال صرف تجربوں ہی میں گذر جاتا ہے۔ مدرسہ کے مصارف تقریباً ۱۵۰۰ پونڈ سالانہ ہیں۔

دنیا کا سب سے زیادہ نرالا اور عجیب کالج، غالباً امریکہ کا سارہ لورنس کالج ہے، یہ کالج نوابوں اور امراء کی لڑکیوں کے لئے ہے، یہ کالج ایک مختصر سی دنیا ہے، اسے خارجی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس میں طالبات کو پوری آزادی ہوتی ہے۔ اقامتی زندگی لازمی نہیں ہے، اگر وہ چاہیں تو اس شرط پر باہر بھی رہ سکتی ہیں کہ اگر کوئی ناگوار صورت پیش آئی تو اس کی تمام ذمہ داری ان کے سر عائد ہوگی۔ کالج بالکل غیر مسئول ہوگا۔ نصاب میں فنون لطیفہ کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

گھوڑے کی سواری، پیرنا، سکیٹنگ (Skating) اور ریوالور کا نشانہ وغیرہ بھی سکھلایا جاتا ہے۔

اجتماعی زندگی میں، جلسے، ایک ساتھ کھانا، پارٹیاں اور صبح و شام کے مخصوص کپڑے وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ اس کالج کی اقامتی زندگی بالکل شاہانہ ہوتی ہے۔ دار الاقامہ میں پہنچنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ یہ پوشش نہیں بلکہ کوئی محل ہے۔ سگریٹ کی وبا بہت عام ہے، سگریٹ پینا عیب نہیں بلکہ نہ پینا عیب ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے وہاں دریافت کیا کہ یہاں کوئی ایسا شخص بھی ہے جو سگریٹ نہ پیتا ہو۔ ایک چنچل لڑکی نے جواب دیا "اس قسم کے جانور ہماری ولایت میں نہیں بستے" لیکن اس آزادی کے باوجود اس سے واقفیت رکھنے والوں کا بیان ہے کہ اسکی فضا بداخلاقی کے جرائم سے پاک ہے۔ اور انکا یہ بیان بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہیں داخلہ کیلئے تمام یورپ سے اس کثرت سے درخواستیں آتی ہیں کہ ان میں سے مشکل سے ایک چوتھائی تعداد کو جگہ ملتی ہے۔ یہ کالج سوسائٹی کے صرف ایک طبقہ کی خدمت کرنی چاہتا ہے۔ یعنی صنف نازک کی

نیویارک کے ایک مدرسہ کے ناظم کو پولیس نے اس جرم میں گرفتار کیا کہ اس اسکول کے لڑکے ننگے رہتے ہیں۔ تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ یہ مدرسہ بہت عرصہ سے قائم ہے اور یہ ان لوگوں کے مطالبہ اور خواہش پر بنایا گیا ہے، جن کا خیال ہے کہ صحت کی حفاظت، ذوق کی اصلاح اور بدن کی خوبصورتی کے بقا کیلئے اس عمر تک ننگے رہنا ضروری ہے چنانچہ جب ناظم مدرسہ نے اپنے مدرسہ کے مقصد کی خوبی اور اپنے حسن نیت کا عدالت کو یقین دلایا تو رہا کر دیا گیا۔

سوئزرلینڈ اور جرمنی (نازی حکومت سے قبل) میں اس قسم کے مدرسے بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں، بعض ورزش اور کھیل کے وقت لباس ضروری ہے، اس کے علاوہ، وہ اس قسم کے قیود سے بالکل آزاد ہیں۔

یورپ کے تقریباً اکثر مدارس میں، ایک خاص قسم کے ورزشی رقص کو جسے Eurythmics کہتے ہیں، تمام دوسرے ورزشوں پر فوقیت اور ترجیح حاصل ہے۔ اس رقص میں مشہور ڈلکروز کے طریقہ کی پابندی کی جاتی ہے۔

تفسیر سورۃ الفیل

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۃ الفیل کا اردو ترجمہ ہے۔ اس کتاب کی ہر فصل ایک مستقل کتاب ہے۔ واقعہ فیل کی اصل حقیقت اس کتاب کی اشاعت سے پہلے بالکل مجہول تھی، علامہ فراہی نے کلام عرب کی مدد سے واقعہ کی تمام تفصیلات فراہم کر کے تمام تاریخی غلطیوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ واقعہ کو بھی عجائب پرستی نے بالکل دوسرا رنگ دیدیا تھا۔ مولانا نے اس واقعہ کے متعلق بعض شاہدوں کی شہادتیں جمع کر کے اس کی اصل حقیقت کو آشکارا کر دی ہے اور اسی سلسلہ میں رمی جمرات اور حج کے دوسرے مراسم کے اسرار و حکم نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ عمدہ حجم ۱۱۳ صفحے۔ قیمت ۸/

تفسیر سورۃ کافرون

اس میں ہجرت اور برأت کا اصلی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور نبوت کے مراحل و مقامات کی توضیح اس قدر حکیمانہ انداز میں کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بے شمار مشکلات آپ سے آپ حل ہو گئی ہیں۔

کتابت و طباعت بہترین۔ کاغذ عمدہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۴۸ صفحے قیمت ۴/

اسباق النحو حصہ اول و دوم

اردو زبان میں عربی صرف و نحو کے بہترین رسالے ہیں۔ قیمت حصہ اول ۵/ حصہ دوم ۶/

تحفۃ الاعراب

اردو زبان میں عربی نحو کے مسائل نہایت بہترین طریقہ سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲/

منیجر